طلوعِ اسلام

مارچ ★ ۱۹۵۳

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

۱. تنہا عقلِ انسانی (عقلِ انسانی) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ عقلِ انسانی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

۴. حضور نبی اکرمؐ [illegible] لیکن [illegible] کسی حدیث کی صحت کا معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کی وحدت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶. اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں [illegible] یہ جزئی قوانین حالات کے ساتھ بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو [illegible] معاشرہ [illegible] ربوبیت [illegible] نوعِ انسانی [illegible]

۸. ربوبیتِ عالمگیر کے مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں نہ رہیں [illegible] قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ [illegible] نور سے جگمگا اٹھے۔

[illegible]

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۶	مارچ ۱۹۵۳ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

قرآن نے کیا کہا؟	۴	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟ (محترم پرویز صاحب) الشرق کراچی	۲۲–۲۷
لمعات	۵–۱۵		
جذبۂ صدیقؓ (نظم) (محترم اسد ملتانی)	۱۷	حقائق و عبر	۴۸–۵۴
قرآنی فیصلے	۱۸	احترام	
نقد و نظر	۱۹–۳۱	اقوام عصرِ حاضر اور اسلام	۵۵–۶۱
ایک اسلام		بھولی ہوئی کہانیاں	۶۲–۷۴

معراج انسانیت

معارف القرآن - جلد چہارم

ترجمان حقیقت، جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں - فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب - شروع میں قریب پونے دوسو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے - اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں - اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں —

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ - جلد مضبوط اور حسین - گردپوش مرصع اور دیدہ زیب - ٹائٹیل اور صحیح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین - قیمت بیس روپے (۲۰) - محصول ڈاک و پیکنگ ایکروپیہ ساڑھے چھ آنے —

نوادرات

مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری

بڑا سائز

ضخامت چارسوصفحات　　قیمت چار روپے　　محصولڈاک نو آنے

ناظم ادارہ طلوع اسلام
(چوک سول ہسپتال) بندر روڈ - کراچی

قرآن نے کیا کہا؟

یہودیوں کی تالمود کو اٹھا کر دیکھئے۔ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے امور اور ذرا ذرا سی باتوں کے متعلق شریعت کے کڑے احکام ملیں گے۔ اٹھو تو یوں کرو، بیٹھو تو یہ پڑھو۔ کھڑے ہو تو یہ الفاظ دہراؤ، کھاؤ تو ادھر منہ رکھو، لیٹو تو ادھر پاؤں نہ کرو۔

ہندوؤں کے شاستروں کو دیکھو۔ سورج نکلنے پر یہ کرو۔ غروب کے وقت یہ پڑھو۔ منگل کی صبح وہاں جاؤ۔ سنیچر کو یوں مناؤ۔ نو من تیل اکٹھا کرو، تب جا کر کہیں رادھا ناچے۔

قرآن نے کہا کہ یہ سب غلط ہے۔ ہم نے انسانی معاشرت کیلئے کھلے کھلے حدود مقرر کر دیئے ہیں۔ واضح اصول دیدیئے ہیں۔ ان حدود سے تجاوز نہ کرو۔ ان کے اندر رہتے ہوئے جس طرح جی چاہے زندگی بسر کرو۔ ان اصولوں کو مت توڑو۔ ان کا لحاظ رکھتے ہوئے معاشرتی جزئیات خود متعین کرو۔ خدا یہ نہیں چاہتا کہ انسانی زندگی کے لئے سختیاں اور جکڑ بندیاں پیدا کرے۔ جو کچھ بتلانا تھا بتا دیا۔ جو نہیں بتایا گیا اس کے متعلق خواہ مخواہ کاوشیں کر کے اپنے لئے سختی اور تنگی نہ پیدا کرو۔

یا ایھا الذین امنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم۔ وان تسئلوا عنھا حین ینزل القرآن تبد لکم۔
عفا اللہ عنھا۔ واللہ غفور حلیم۔ قد سألھا قوم من قبلکم ثم اصبحوا بھا کفرین (۵/۱۰۱-۱۰۲)

اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تم پر گراں گذریں۔ اگر تم انھیں ایسے وقت پوچھو گے جب قرآن نازل ہو رہا ہے تو (ظاہر ہے کہ) وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ (لیکن اس کا نتیجہ خود تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا۔ اب تو) خدا نے یہ بات معاف کر دی ہے (لیکن آئندہ احتیاط برتو) اللہ بخشنے والا اور (انسانی خطاؤں کیلئے) بردبار ہے۔ تم سے پہلے ایک گروہ (بنی اسرائیل) نے ایسی ہی باتیں (کرید کرید کر) پوچھی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے۔

یہ تو خدا نے کہا لیکن ہمارے ارباب شریعت نے فرمایا کہ نہیں۔ یہ غلط ہے۔ جن امور کو خدا نے اصولاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی۔ جن احکام کی اس نے مقدار، یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا۔ ان سب کی تفصیلات متعین کی جائیں گی۔ کہیں روایات کے ذریعہ اور کہیں فقہ کی رو سے۔ اور اس طرح مجمل کو مفصل، مطلق کو مقید اور غیر معین کو معین بنا کر چھوڑا جائیگا۔ اور اس کا نام رکھا جائے گا اتباعِ سنت اور تقلیدِ ائمہ۔ حالانکہ خود رسول اللہؐ کی یہ حدیث بھی یہی حضرات بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا

ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا۔ وحرم حرمات فلا تنتھکوھا۔ وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔

اللہ نے تم پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں انھیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ وہ بھول گیا ہو، ان کی کھوج مت لگاؤ۔ (بحوالہ تفہیم القرآن۔ ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ ص۵۰۸)

وہ ہے خدا کا حکم۔ یہ ہے (اس کے مطابق) اس کے رسولؐ کا ارشاد۔ اور ان دونوں کے خلاف وہ ہے ہمارے ارباب شریعت کا مسلک۔ جو قرآن کے بیان کے مطابق یہودیوں کا مسلک تھا اور جس کا نتیجہ (قرآن کی رو سے) کفر تھا۔

طلوعِ اسلام خدا اور اس کے رسول کی انہی تنبیہات کی طرف توجہ دلاتا ہے لیکن ارباب شریعت اسے کافر قرار دیتے ہیں اور خود مومن بنتے ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

انسان کیلئے مستقبل میں کیا لکھا ہے؟ اس کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن اگر اس کے ماضی کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو بلا خوف تردید کہا جا سکے گا کہ بیسویں صدی جیسا وحشت انگیز دور اس سے قبل شاید ہی کبھی آیا ہو۔ اس دور کی دیگر تباہ انگیزیوں سے قطع نظر، انسان کی آنکھوں نے جو کچھ ان دو مہیب اور خطرناک لڑائیوں میں دیکھا ہے جو پچیس برس کے قلیل عرصہ میں سامنے آچکی ہیں، اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ آسمان میں آگ، زمین میں آگ، خشکی میں آگ، پانی میں آگ، انفس میں آگ، آفاق میں آگ، غرضیکہ ایک جہنم تھا جو اپنی پوری شعلہ فشانیوں اور آتش باریوں کے ساتھ نوع انسانی پر مسلط ہو رہا تھا۔ بم، گولے، بارود، گیس وغیرہ کے اس طوفانِ حدود فراموش وسیلِ قیود ناآشنا میں محارب اور غیر محارب آبادیوں کی کوئی تمیز نہ تھی حالت یہ تھی کہ ماں کو بچے کی خبر نہیں، باپ کو بیٹے کا ہوش نہیں، بہن کو بھائی کا علم نہیں، میاں کو بیوی کا پتہ نہیں۔ ایک محشر تھا جس سے اُس طامۃ الکبریٰ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ

ان زلزلۃ الساعۃ شئ عظیم۔ یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ ارضعت وتضع کل ذات حمل حملھا وتری الناس سُکٰرٰی وما ھم بسکٰرٰی۔ ولکن عذاب اللہ شدید۔ (۲۲/۱-۲)

اس معینہ ساعت کا زلزلہ بھی کس قدر خطرناک ہوگا۔ جس دن تم دیکھو گے کہ دودھ پلانے والی مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو بھول جائیں گی اور حمل والی عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے۔ اور تو ایسا محسوس کریگا گویا لوگ بالکل مدہوش ہو رہے ہیں حالانکہ وہ نشہ کی بیہوشی میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کے عذاب کی سختی نے ان کے حواس باختہ کر رکھے ہوں گے۔

ایسا ہوش ربا سانحہ کہ

یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ وصاحبتہ وبنیہ۔ لکل امرئ منھم یومئذ شأن یغنیہ (۸۰/۳۴)

جس دن بھائی اپنے بھائی سے، اپنے ماں باپ سے، اپنی بیوی اور اولاد سے بھاگے گا۔ ہر شخص کو اس طرح اپنی پڑی ہوگی کہ وہ کسی دوسرے کی طرف دیکھ ہی نہیں سکے گا۔

جس دن کی آتش فشانی کا یہ منظر ہوگا کہ

انھا ترمی بشرر کالقصر کانہ جمالۃ صفر۔ (۷۷/۳۲)

بڑے بڑے محلات جتنے گولے۔ اتنے بڑے گویا وہ زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

اس آگ اور دھوئیں سے صفحۂ ارض کا حلیہ بگڑ جائے گا۔

اذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت واذا الجبال سیرت واذا العشار عطلت واذا الوحوش حشرت واذا البحار سجرت۔ (۸۱/۱-۶)

جب آفتاب بے نور ہو جائے گا۔ تارے ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائیں گے۔ جب گابھن اونٹنیاں بے مہار پھریں گی۔ جب وحشی جانور (مارے ہیبت کے) اکٹھے ہو جائیں گے۔ جب سمندر تک بھی بھڑک اٹھیں گے۔

مصیبت اور پریشانی کا یہ عالم کہ

یوم یکون الناس کالفراش المبثوث وتکون الجبال کالعہن المنفوش۔ (۱۰۱/۱-۵)

جب انسان پریشان پروانوں کی طرح اڑتے پھریں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

پوچھئے کسی ایسے شخص سے جس نے گذشتہ جنگ میں لڑائی کا کوئی میدان دیکھا ہو کہ وہاں کا نقشہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے یا نہیں۔ عمارتیں کھنڈرات بن جاتی ہیں۔ آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ چلتے پھرتے انسان لاشوں کے ڈھیر بن کر رہ جاتے ہیں۔ جو جیتے ہیں ان پر گوشۂ عافیت تنگ ہو جاتا ہے۔ زخمیوں کے کراہنے کی آواز۔ لاشوں کی تعفن، بھوک، افلاس، خانہ خرابی، دشمن کے حملے کا خطرہ، ہر طرف پریشانی ہی پریشانی۔ یہ کچھ تھا جو گذشتہ عالمگیر لڑائیوں میں نوع انسانی پر گذرا۔

لیکن اگر انہی دو عالمگیر لڑائیوں کے بعد قصہ ختم ہو جاتا تو بھی غنیمت تھا۔ مصیبت تو یہ ہے کہ یہاں ہر ختم ہونے والی جنگ ایک آنے والی جنگ کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ گذشتہ جنگ ایک ایسا میچ تھا جس میں دو ٹیمیں (SEMI-FINAL) میں آگئیں۔ ایک امریکہ اور دوسرا روس۔ اب ان دو ٹیموں میں فائنل میچ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اگر صورت حالات یوں ہوتی کہ یہ دو ٹیمیں فائنل کا میچ کھیلتیں اور باقی ساری دنیا محض تماشائی ہوتی تو بھی چنداں مضائقہ نہیں تھا لیکن یہاں تو یہ مشکل ہے کہ یہ کھیل انہی دو ٹیموں میں نہیں ہوگا بلکہ ان کی کوشش یہ ہے کہ پوری کی پوری دنیا کھیل کے میدان میں آجائے اور تماشائی باقی ہی نہ رہیں۔ پہلے زمانے میں یوں ہوتا تھا کہ دو بادشاہوں میں اعلانِ جنگ ہوتا۔ لیکن ان کی طرف سے دو پہلوان میدانِ جنگ میں آجاتے۔ یعنی جنگ تو ہوتی بادشاہوں میں اور لڑتے مرتے پہلوان۔ اس کے بعد پہلوانوں کی جگہ فوجوں نے لی اور یہی شکل آج تک چلی آتی ہے یعنی جنگ ہوتی ہے دو بادشاہوں یا دو حکومتوں میں اور لڑتے مرتے ہیں سپاہی۔ جن کی باہمی نہ کوئی دشمنی ہوتی ہے نہ عداوت حتیٰ کہ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک بھی نہیں ہوتا۔ اب اس مسئلہ نے ایک تیسری شکل اختیار کر لی ہے اور وہ یہ کہ جنگ ہوتی ہے دو طاقت ور قوموں میں اور تباہی آتی ہے کمزور قوموں پر۔ اس وقت بدبختی سے دنیا میں سب سے زیادہ کمزور حکومتیں مسلمانوں کی ہیں، اس لئے جنگ انگریز اور جرمن کے درمیان ہو یا امریکہ اور روس کے درمیان، پٹتے بہرحال مسلمان ہیں۔ سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

چنانچہ آنے والی جنگ کی تیاریوں کے سلسلہ میں امریکہ اور روس دونوں کی طرف سے کھینچا تانی ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کی ان کمزور اقوام کا زیادہ سے زیادہ حصہ ان کے ساتھ ہو جائے۔ لیکن چونکہ دورِ حاضرہ کی سیاست کا مدار ہی فریب کاری پر ہے اسلئے کھلے الفاظ میں یہ نہیں کہا جاتا کہ تم ہمارا ساتھ دو تاکہ ہم اپنے فریقِ مقابل پر کامیابی حاصل کرلیں۔ کہا دونوں طرف سے یہ جاتا ہے کہ ہم تمہاری حفاظت کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں امریکہ نے ایک عرصہ سے یہ آواز بلند کرنی شروع کر رکھی ہے کہ دنیا کے خدا پرستو! اٹھو اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کرو جو خدا اور مذہب کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس مقصد کے لئے امریکن بلاک پانی کی طرح روپیہ بہا رہا ہے۔ اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ مذہب کے علمبرداروں کو اپنے ساتھ ملانے کیلئے روپیہ سے زیادہ وجہ کشش اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس موضوع پر ہم اپنی اشاعت بابت مئی ۱۹۵۲ء میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑا فریب ہے جو مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کے وہ مقدس پیشوایانِ مذہب جو بڑھ چڑھ کر زمینداری اور جاگیرداری کو عین اسلام بتا رہے ہیں اسی بلاک کی سیاسی کام جوئیوں کا آلۂ کار ہیں۔ چنانچہ ہم نے لکھا تھا کہ

> امریکی بلاک کی طرف سے یہ دعوتِ محاذِ متحدہ خدا کے نام کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ اپنی حفاظت کیلئے ابلیسی سیاست کا نقاب پوش حربہ ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ مشرقی ممالک میں بالعموم اور مسلمانوں کے عوام میں بالخصوص یہ حربہ بہت کارگر ثابت ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں مُلّا بھی انگریز پرست اور ٹوڈی کہلا کر بدنام نہیں ہوتا بلکہ "دعوت الی اللہ" کا نقیب بن کر سامنے آتا ہے اور اس کی "دین اور دنیا" دونوں سنور جاتے ہیں۔ دنیا میں بھی حور و قصور، جنت میں بھی حور و قصور۔
>
> فرنگ آئینِ رزّاقی بداند — بایں بخشد ازو وا می ستاند
>
> بشیطاں آنچناں روزی رساند — کہ یزداں اندراں حیراں بماند
>
> (طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۵۲ء)

امریکن بلاک کے اسی حربہ کی ایک بڑھی ہوئی شق ہے جسے اب مشرقِ وسطیٰ کے حفاظتی ادارہ (MEDO) کی شکل میں آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ یہ وہی امریکہ ہے جس نے اپنی پوری قوتوں سے مشرقِ وسطیٰ کے عین مرکز میں، یہودیوں کی ایک مستحکم سلطنت قائم کر کے رکھدی ہے اور اس طرح ان اسلامی ممالک کے قلب میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ وہی امریکہ اب مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کے تحفظ کا درد اپنے جگر میں لئے ہراساں و پریشاں پھر رہا ہے۔

لیکن اس کے مقابلہ میں اس کا حریف روس بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہے۔ ایران میں اس کا اثر پہلے ہی سے غالب ہے وہاں تودہ پارٹی اور آذربائیجان کی ڈیماکریٹک پارٹی سب سے زیادہ منظم اور صاحبِ اقتدار ہیں اور یہ دونوں پارٹیاں کمیونزم سے متاثر ہیں۔ تیسری پارٹی ڈاکٹر مظفر بقائی کی ہے جو طہران کی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ یہ اگر کمیونسٹ نہیں تو متشدد قسم کے اشتراکی ضرور ہیں۔ اربابِ فکر کا اندازہ یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر مصدق کو شکست ہوئی تو ڈاکٹر بقائی برسرِ اقتدار آ جائے گا۔ اس صورت میں ایران میں روس کا اثر اور بھی غالب آ جائے گا۔ بعض لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ اس صورت میں غالباً کاشانی کی جماعت کا

معتدبہ حصہ بھی کمیونسٹوں کا ساتھ دیگا۔

اگر ایران میں یہ اثر غالب آگیا تو اس کا لازمی اثر عراق پر بھی پڑے گا۔ عراق میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے میلانات روس ہی کی طرف بتائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں کُردوں کا مسئلہ ہے جو موصل کے گرد و نواح میں آباد ہیں۔ ان کردوں کے رجحانات بہرحال روسی ترکستان کی طرف ہیں۔ باکو، جو روسی کُردوں کا مرکز ہے اس قسم کے خیالات کو نشر کرتا رہتا ہے کہ موصل کے کردوں کی ایک جمہوریہ بنائی جاسکتی ہے۔

شام میں کرنل شیشاکلی کا اثر غالب ہے۔ اگرچہ ان کے پیش نظر سب سے اہم سوال عربی ممالک کی متحدہ مملکت کا قیام ہے لیکن روس کی نگاہ عرصہ سے ان کی ایک دکھتی ہوئی رگ پر تھی جس کو اس نے (جیسا کہ ذرا آگے چل کر لکھا جائے گا) حال ہی میں پکڑ لیا ہے۔ یوں تو فلسطین میں یہودیوں کی سلطنت کم و بیش تمام عربی ممالک کے لئے جگر کا ناسور ہے لیکن شیشاکلی اس سے خاص طور پر دردمند ہے عربی ممالک کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی یہودیوں کی یہ سلطنت خارِ چشم بن رہی ہے۔

روس نے اس صورت حالات کا خوب مطالعہ کیا اور فلسطین کی یہودی سلطنت کی مخالفت کا اعلان کر دیا۔ اس سے اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ تمام عالمِ اسلام کی ہمدردیاں اپنے ساتھ شامل کر لی جائیں۔ اس نے ایک طرف یہ کیا ہے اور دوسری طرف وہ تمام امن کانفرنسیں (Peace Conferences) جو اس نے مختلف ممالک میں پھیلا رکھی ہیں اس مقصد کو لیکر باہر نکل آئی ہیں کہ کوئی ملک (MEDO) میں شامل نہ ہو۔

یہ ہیں مختصراً وہ مہرے جو دونوں متخالف فریقوں کی طرف سے بساطِ سیاست پر اس لئے رکھے جا رہے ہیں کہ مسلمانوں کی کمزور مملکتوں کو آئندہ والی جنگ میں اپنی اپنی طرف سے فریقِ مخالف کی توپوں کا چارہ بنایا جائے۔ کمزور کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ طاقتوروں کی لڑائی میں ان کے لئے زندگی وبالِ دوش بن جاتی ہے۔ ایک طاقت ان کے منہ پر رسی باندھ کر اپنی طرف کھینچتی ہے (عربی میں اسے اعتناک کہتے ہیں۔ یعنی گھوڑے یا گدھے کے منہ میں لگام دینے کی بجائے اس کے منہ پر یونہی رسی باندھ کر آگے سے کھینچا جائے) اور دوسری طاقت اس کے پاؤں میں رسی باندھ کر اسے پیچھے کی طرف کھینچتی ہے۔ ابلیس نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا جب خدا سے کہا تھا کہ اگر تو مجھے قیامت تک کی مہلت دیدے لاحتنکن ذریتہ الا قلیلا (۱۷/۶۲) تو میں نسلِ انسانی کے تھوڑے سے حصہ کو چھوڑ کر باقیوں کی کیفیت یہ کر دوں کہ ان کی تھوتھنی پر رسی باندھ کر جدھر جی چاہے لئے لئے پھروں۔ اس احساس سے ہماری آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں کہ آج ان بڑی قوتوں (Big Powers) کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مملکتوں کا یہی حشر ہو رہا ہے۔ ایک طرف انھیں امریکہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے دوسری طرف روس۔ اور دونوں کی طرف سے وہی ابلیسی حربے استعمال ہو رہے ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا تھا۔

واستفزز من استطعت منهم بصوتك واجلب عليهم بخيلك ورجلك وشاركهم في الاموال والاولاد وعدهم ..... (۱۷/۶۴)

تو اپنے پروپیگنڈے سے ان میں گھبراہٹ پیدا کردے۔ اپنے سواروں اور پیادوں کو چاروں طرف سے اکٹھا کرکے لا کہ وہ ان کے گرد گھیرا ڈال لیں اور ان کی دولت میں اپنی دولت کو شامل کردے اور ان کی بڑھنے والی نسلوں کو اپنے تصورات سے متاثر کردے اور ان سے ہر قسم کے وعدے کرتا چلا جا۔

یہ ہیں وہ حربے جن سے یہ ابالیس دہر اور شیاطین عصر حاضر ملت اسلامیہ کی کمزور مملکتوں کو کہیں تحریص و ترغیب سے اور کہیں تخویف و ترعیب سے اپنے ساتھ شامل کرنے کی ملعون کوششوں میں سرگرم عمل ہیں۔ لیکن اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ قصور تو ان کا ہے جو ان کے اس فریب میں آسانی سے آجاتے ہیں۔ حالانکہ ان سے کھلے کھلے الفاظ میں کہدیا گیا تھا کہ وما یعدھم الشیطان الا غرورا (۴/۱۲۰) کہ یاد رکھو ان سرکش قوتوں کے اس قسم کے وعدے یکسر فریب ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ابلیس سے کہدیا گیا تھا کہ جو کچھ تیرے جی میں آئے کرلے۔ ان عبادی لیس لک علیھم سلطن (۱۵/۴۲) کہ جو لوگ میرے قانون کی محکومیت اختیار کئے ہوں گے ان پر تیرا کوئی زور نہیں چل سکے گا۔ وہ دنیا میں نہ کسی دوسرے کی مدد کے محتاج ہوں گے نہ کسی کے آسرے کے متمنی اس لئے کہ کفیٰ بربک وکیلا (۱۷/۶۵) ان کے خدا کا نظام ربوبیت ان کے کامل اعتماد کے لئے کافی ہوگا۔

غالب نے کہا تھا کہ

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

یہی کچھ قرآن نے ان کمزور قوموں کے متعلق کہا ہے جنھیں طاقتور قومیں کشاں کشاں میدانِ جنگ میں لیجاتی ہیں اور پھر ان کی وجہ سے ساری دنیا میں فساد ہی فساد برپا ہوجاتا ہے۔ قرآن نے کئی ایک مقام پر کمزور اور طاقتور قوموں کے درمیان جہنم میں مکالمات کا ذکر کیا ہے۔ جس میں وہ ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں کہ تم ہی اس تباہی اور بربادی کے ذمہ دار ہو۔ قال الذین استکبروا للذین استضعفوا انحن صددنا کم عن الھدی (۳۴/۳۲) ارباب قوت ان کمزور قوموں سے کہیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں صحیح راستہ سے روکا تھا؟ بل کنتم مجرمین۔ ہمارا اس میں کچھ قصور نہیں۔ تم خود ہی مجرم تھے۔ وقال الذین استضعفوا للذین استکبروا بل مکر اللیل والنھار اذ تامرونا ان نکفر باللہ یہ کمزور اقوام ان سے کہیں گی کہ تمہاری دن رات کی تدبیریں اور اسکیمیں تھیں جن سے ہم اس پر مجبور ہوگئے تھے کہ سچائی کے راستے سے انکار کردیں۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ یہ کمزور قومیں خدا سے کہیں گی کہ یا اللہ ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ فاٰتھم عذابا ضعفا من النار۔ انھیں دگنی سزا دو۔ اس کا جواب ملے گا۔ قال لکل ضعف۔ تم دونوں ہی کیلئے دوگنا عذاب ہے۔ اس لئے کہ اگر تم ان کی تقویت کا باعث نہ بنتے تو یہ دنیا میں اسقدر فساد کیوں برپا کرتے۔

انھیں تو تم کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا جناب تم نے بنایا حضور تم نے کیا

لہٰذا مسلمان اقوام عالم کے لئے سیدھی راہ یہ ہے کہ وہ نہ امریکن بلاک کی تقویت کا باعث بنیں اور نہ روس کی طاقت کا موجب۔ ان کے نزدیک سگ زرد برادر شغال دونوں یکساں ہیں۔ امریکہ کی خدا پرستی کا دعویٰ قرآن کی رو سے قطعاً خدا پرستی نہیں اور روس کا یہ دعویٰ کہ وہ مزدوروں اور غریبوں کی مدد کے لئے اٹھا ہے ایسی حق کی آواز ہے جو باطل کی تائید کے لئے بطور دلیل

استعمال کی جارہی ہے (کلمۃ حق اریدبہ الباطل) ان کے لئے صحیح راہ عمل صرف ایک ہے کہ وہ خود ایک امت واحدہ بن کر قرآن کا نظام ربوبیت اپنے ہاں رائج کریں اور پھر دیکھیں کہ کس طرح روس اور امریکہ دونوں ان کے سنگ آستاں پر سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

افرنگ زخود بیخبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

لیکن اگر ابھی تک ہماری سزا کی مدت پوری نہیں ہوئی اور یہ سعادت ہمارے حصہ میں نہیں آرہی کہ ہم قرآن کو محور بنا کر ایک ملت واحدہ کی حیثیت سے اس کے گرد گردش کریں اور ہمارے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ ہمیں بہرکیف کسی کے ساتھ ہی ہونا ہے تو کم از کم اتنا تو کیا جائے کہ اس سودے میں اپنی قیمت پہلے وصول کر لی جائے۔ ورنہ یہ قومیں اپنا کام نکالنے کے بعد جس طرح آنکھیں پھیر لیتی ہیں اس کا مسلمانوں کو کافی تجربہ ہو چکا ہے ومن جرب المجرب حلت بہ الندامہ۔ اس میں نہ امریکہ کی کوئی رعایت ہونی چاہئے نہ روس کی۔

(۲)

معاصر "ڈان" نے اپنی ۷ فروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے "یہ مجرم قیادت"۔ اس مقالہ کے شروع میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ملک میں تفرقہ بازی شروع ہو چکی ہے۔ صوبائی تعصب کی لعنت ہر طرف پھیل رہی ہے اور اس طرح مملکت کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں اور اس کی سالمیت خطرہ میں پڑ چکی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے مفاد کے تحفظ میں مصروف ہے اور مملکت کے مفاد کلی کا کسی کو خیال نہیں۔ معاصر مذکور نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

> خود غرضی کی اس لعنت میں پاکستان کے عوام گرفتار نہیں۔ اس میں صرف وہ گنتی کے چند لوگ ماخوذ ہیں جو اپنے آپ کو لیڈر کہتے ہیں ..... وہ وقت دور نہیں جب یہ لیڈر پاکستان کے عوام کو دھوکہ دے جائیں گے۔ انھوں نے اپنے قائد محمد علی جناحؒ کے اس ارشاد کو فراموش کر دیا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ "متحد رہو، یقین محکم رکھو اور اپنے اندر ڈسپلن پیدا کرو"۔ یہ لیڈر مناصب اور مدارج کے پیچھے مارے مارے پھر رہے ہیں اور حصول اقتدار کے لئے باہم دگر دست و گریباں ہیں۔ یہی لوگ نچلے درجے کے طبقہ میں خود غرضی، عدم اعتمادی، تفرقہ، بلکہ نفرت کے بدترین جذبات مشتعل کر رہے ہیں۔

اس کے بعد اس اخبار نے لکھا ہے کہ

> وہ مسلم لیگ جو اس کی مدعی ہے (اور اس کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے) کہ اس نے پاکستان کی لڑائی کامیابی سے لڑی اور جس نے اپنی سابقہ خدمات کے پیش نظر مرکز اور صوبوں کی حکومت کو چلایا ہے، وہ مسلم لیگ آج تشتت و افتراق، بدنظمی اور تفرقہ انگیزی کا اکھاڑہ بن چکی ہے۔

اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ

جو حضرات ملتِ پاکستانیہ کی قیادت اور حکومت کو اپنے ہاتھ میں لئے ہیں انھیں چاہئے کہ وہ مذکورہ بالا حقائق کا سامنا کریں اور رئیس مملکت سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے صوبہ کے وزیروں تک ہر ایک کو چاہئے کہ اپنا محاسبۂ نفس کرے۔ اسی طرح مسلم لیگ کے رہنماؤں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔

ہمیں خوشی ہوئی کہ معاصر ڈان کو کم از کم چھ سال کے بعد اس کا احساس ہوا کہ ملک میں تفرقہ پھیل رہا ہے، صوبائی تعصب کا جذام جسدِ ملت میں بری طرح سے ناسور پیدا کر رہا ہے۔ نیز یہ بھی کہ اس تمام صورت حال کی ذمہ دار ہماری قیادت ہے جسے اس نے "مجرم" کے لقب سے پکارا ہے جس حقیقت کو معاصر ڈان نے آج قریب چھ سال کے بعد پیش کیا ہے طلوع اسلام چھ سال سے مسلسل پوری شدت اور تکرار کے ساتھ اس کی طرف توجہ دلاتا چلا آرہا ہے۔ پاکستان میں طلوع اسلام کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس پہلی اشاعت ہی میں آپ کو یہ الفاظ دکھائی دینگے۔

ہم پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اس بعد و فصل اور بیگانگی و مغائرت کا رونا رو رہے ہیں جس کا ہمیں مستقبل میں خدشہ نظر آتا ہے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ خود پاکستان کے مسلمانوں میں صوبائی تعصب اسقدر شدید ہے کہ اس کا احساس ہر قلب دردآگیں کے لئے وجہ ہزار اضطراب ہے۔

اسی اشاعت میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں میں ائتلاف و مواخات کے سلسلہ میں لکھا گیا تھا کہ

پاکستان کے مسلمانوں میں مشرق و مغرب میں تمیز و تفریق ایک حقیقت ابدی کا بطلان اور ایک صداقت ازلی کی تکذیب ہے ہم اپنے سینوں کو اس آفتاب جہانتاب کی درخشندہ شعاعوں سے مستنیر کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں جس کے متعلق فرمایا ہے کہ لا شرقیۃ ولا غربیۃ (جو نہ شرقی ہے نہ غربی) اس لئے اگر ہمارے ذہن میں ایک ثانیہ کے لئے بھی مشرقی و مغربی پاکستان میں کسی قسم کی مغائرت و تفریق کا تصور آگیا تو ہم ان ازلی صداقتوں کے عملی منکر ہوں گے جن پر ایمان ہمارے لئے وجہ سعادت کونین ہے۔ یہ امتیازات اس دورِ جاہلیت کی تخلیق تھے جسے ہم جھٹک کر الگ کر چکے ہیں۔ اس لئے اب ان کی یاد تک بھی ہمارے دلوں میں نہیں آنی چاہئے کہ جو بت حریم کعبہ سے ایک مرتبہ نکال دیئے گئے وہ وہاں دوبارہ باریابی نہیں پا سکتے۔

یہ کچھ ہم نے پہلے دن لکھا تھا اور اس کے بعد آج تک اسے برابر دہراتے چلے آرہے ہیں کہ صوبائی تفریق مملکت پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیگی اور اس طرح ہماری وہ حسین اور مقدس آرزوئیں جو اس سرزمین کے ساتھ وابستہ ہیں خواب پریشاں بن کر رہ جائیں گی معاصر ڈان نے صرف علامات مرض کی طرف اشارہ کیا ہے اس نے نہ تو اس مرض کے اسباب و علل بتلائے ہیں اور نہ ہی اس کا علاج۔ اس کے برعکس طلوع اسلام شروع سے ان اسباب و علل سے بھی بحث کرتا چلا آرہا ہے جن سے یہ مرض پیدا ہوا ہے اور وہ علاج بھی بتاتا رہا ہے جس سے یہ مرض دور ہو سکتا ہے۔ طلوع اسلام نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ ملت میں تفرقہ انگیزی کا ایک بنیادی سبب صوبوں کا وجود ہے یہ صوبے ہمارے لیڈروں کی ہوس اقتدار اور حرص مناصب و مدارج کو بڑھانے کا موجب بن رہے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے مفاد یا انتظامی سہولتوں کی غرض سے ملک کو صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ اب یہی تقسیم ملت میں تفرقہ انگیزی کا موجب بن رہی ہے۔

اسی بنا پر طلوعِ اسلام نے تجویز یہ پیش کی تھی کہ ملک سے صوبوں کا وجود ختم [illegible] ساری مملکت ایک مرکز کے تابع رہے اور اسی مرکز سے شائع شدہ قوانین واحکام پوری ملت پر نافذ ہوں۔ یہی وہ تجویز تھی جسے ہم نے دستورِ پاکستان کے سلسلہ میں ایک متعین صورت میں پیش کیا تھا۔ لیکن اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا اور آج ملک کی وہ حالت ہوگئی جس کا رونا معاصر "ڈان" نے اس طرح رویا ہے۔

پاکستان میں صوبائی تفریق بلکہ منافرت کے جذبات آہستہ آہستہ پرورش پا رہے تھے کہ ۱۹۴۹ء میں حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی نیابت الگ الگ ہو اور مغربی پاکستان کے حصہ کی اسامیاں پنجاب، سرحد، سندھ، کراچی، بلوچستان اور قبائلی علاقہ میں الگ الگ تقسیم کی جائیں۔ یہ وہ فیصلہ تھا جس سے مختلف صوبوں کے درمیان مستقل دیواریں کھنچ گئیں اور اس طرح ملت بری طرح سے ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ طلوعِ اسلام نے اس آنیوالے خطرہ سے اسی وقت آگاہ کر دیا تھا چنانچہ اس نے ستمبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ

> ایک طرف زبان سے یہ کہا جاتا ہے کہ صوبائی امتیاز ایک خبیث لعنت ہے اور مستقبل میں تشویش انگیز نتائج کا پیش خیمہ ہے اور دوسری طرف اس تعصب کی جڑیں ایسی مضبوط . . . . کی جا رہی ہیں جو کسی سے اکھیڑے نہ اکھڑ سکیں۔ معاشرتی زندگی میں صوبائی تعصب طنز وتشنیع سے آگے نہیں بڑھا کرتا لیکن جب آپ صوبائی حدود کے ساتھ مستقل مفاد وابستہ کر دیں تو یہ وہ ہڈی ہوتی ہے جس پر انسان کتوں کی طرح لڑتے ہیں۔

اس کے بعد اس کا علاج یہ لکھا تھا کہ

> یاد رکھئے ہماری محکم اور پائیدار حکومت اسی صورت میں قائم ہو سکے گی جب ہم ان صوبائی نسبتوں سے بلند ہو کر صرف اسلامی نسبت کو پیش نظر رکھیں اور کسی کو کبھی یہ خیال تک بھی نہ گذرے کہ فلاں شعبہ میں ہمارے صوبہ کی نمائندگی کسقدر ہے۔ صوبوں کی لکیریں محض نظم ونسق کی سہولت کی خاطر کھینچی گئی تھیں نہ کہ ملک کے باشندوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے۔ اگر یہ لکیریں اس قسم کی تفریق کے خطوط بن رہی ہیں تو ان لکیروں کو جسقدر جلد مٹایا جا سکے اتنا ہی اچھا ہے تاکہ
>
> ایک ہوں سارے حرم کی پاسبانی کیلئے

طلوعِ اسلام نے ملت میں تفرقہ انگیزی کا دوسرا بنیادی سبب سیاسی پارٹیوں کا وجود قرار دیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے مئی ۱۹۴۸ء میں لکھا تھا کہ ہمیں سب سے پہلے مسلم لیگ کو بحیثیت ایک پارٹی کے ختم کر دینا چاہئے۔ اور ساری ملت کو ایک پارٹی تصور کرنا چاہئے اس کے بعد لکھا تھا کہ

> پاکستان میں پارٹیوں کا وجود ختم کر دینے سے فقط ملت باقی رہ جائیگی اور ملت کے بہترین افراد اس کے نمائندہ ہوں گے۔ نمائندوں کے انتخاب میں معیار انتخاب امیدواروں کے جوہر ذاتی ہوں گے نہ کہ پارٹیوں کے لیبل۔ اس طرح پارٹی بازی کے جہنم سے نکل کر ہم ملت واحدہ کی جنت کی طرف آسکیں گے۔

ہم نے اپنی اس تجویز کو بار بار دہرایا لیکن اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔ توجہ دینا تو ایک طرف، مسلم لیگ کو برابر خدا کی رحمت اور ملت کی واحد نمائندہ جماعت قرار دیا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ اسی معاصر ڈان کی اشاعت بابتہ ۱۱ر نومبر ۱۹۵۰ء میں شائع شدہ خبر کے مطابق، لیاقت علی خاں مرحوم نے اپنی ایک تقریر میں یہاں تک بھی کہدیا کہ

اگر کوئی مسلمان مسلم لیگ کو چھوڑتا ہے تو یوں سمجھئے جیسے کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر صداقت کی تلاش میں کسی اور طرف جاتا ہے۔

خود ہی مسلم لیگ کو یہ حیثیت دیدی اور اس کے بعد اب خود ہی رویا جا رہا ہے کہ مسلم لیگ نے ملک میں تشتت و انتشار پیدا کر دیا ہے۔ یاد رکھئے اس مرض کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ملک میں پارٹی سازی کو قانوناً جرم قرار دیدیا جائے اور اس قانون کے ماتحت سب سے پہلا مسلم لیگ کو ختم کیا جائے۔ ملکت میں پارٹیوں کا وجود اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

باقی رہا خود غرضی کا سوال، سو اس کا حل بھی اس تدبیر کے سوا اور کچھ نہیں جسے طلوع اسلام اپنی بصیرت قرآنی کی روشنی میں ایک عرصہ سے پیش کرتا چلا آ رہا ہے اور وہ یہ کہ رزق کے سرچشمے (یعنی وسائل پیداوار) افراد کی ملکیت میں ہرگز ہرگز نہیں رہنے چاہئیں۔ انھیں نظام مملکت کی تحویل میں رہنا چاہئے۔ اس تجویز کو بھی ہم ایک متعین شق کی صورت میں اپنے مسودۂ دستور پاکستان میں پیش کر چکے ہیں۔

ہم اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ جب تک مذکورہ صدر تدابیر پر عمل نہیں ہوگا ملک کی موجودہ حالت میں اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اور اگر اس کی طرف جلد توجہ نہ کی گئی تو اس کے نتائج وہی ہوں گے جس کی طرف معاصر ڈان نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

پاکستان کے عوام اس توقع پر انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے لیڈر اپنے اختلافات کو دور کر لیں گے اور اس مشکل کا حل دریافت کر لیں گے جو ان کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ وہ اس توقع پر انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اگر انھوں نے دیکھا کہ ان کا انتظار بے سود ہے اور انھوں نے اپنے لیڈروں کے ساتھ غلط توقعات وابستہ کی تھیں تو وہ اس چیز کا مطالبہ کریں گے جو بالکل بدیہی ہے۔ ہم آج اس کی وضاحت نہیں کرنا چاہتے کہ وہ بدیہی مطالبہ کیا ہوگا؟ اس لئے کہ ہمیں ابھی تک یقین ہے کہ اس مطالبہ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

(۳)

۱۱ر فروری ۱۹۵۳ء کو ڈھاکہ میں "ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان" کا افتتاح کرتے ہوئے محترم غلام محمد صاحب (گورنر جنرل پاکستان) نے فرمایا کہ

اسلام تعصب کی تعلیم نہیں دیتا، نہ ہی اس میں برتری یا ملائیت کی کسی شکل میں بھی گنجائش ہے۔ یہ حریت فکر کی تعلیم دیتا ہے اور افراد کے حقوق و واجبات پر زور دیتا ہے۔ (ڈان ۱۲ر فروری ۱۹۵۳ء)

اسی جلسہ میں ملک فیروز خاں نون (گورنر مشرقی پاکستان) نے فرمایا کہ

پاکستان میں حکومت بذریعہ اجماع ہوگی۔ یعنی عوام کی آراء کے مطابق حکومت، جس کا اظہار ان کے منتخب کردہ نمائندوں کی رو سے ہوگا۔ اور یہی پاکستان کے اقتدار اعلیٰ کی حیثیت رکھیں گے۔

اس سے قبل محترم غلام محمد صاحب اگست ۱۹۵۲ء میں ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کراچی کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے انہی خیالات کا حسب ذیل الفاظ میں اظہار کر چکے ہیں:-

اکثر لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم زندگی کے معاملات میں مذہب کو بہت زیادہ دخیل کر رہے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام ایک جامد مذہب کا نام ہے جو ارتقاءِ انسانیت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ گزشتہ ایک ہزار سال کے عرصہ میں اسلام نے استبداد کے ہاتھوں بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ ہوا یہ کہ ان مستبد حکمرانوں نے اسلام کو بطور ایک آلۂ کار کے استعمال کیا۔ مفاد پرست گروہ ان کے ساتھ تھا اور مذہبی پیشوا (علماء) ملوکیت اور مفاد پرستی کے منشاء کے مطابق اسلام کی تاویلات کرتے جاتے تھے اور چونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہی لوگ مذہب کے واحد ٹھیکہ دار ہیں اس لئے جو کچھ یہ کہتے ہیں وہی مذہب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر شخص خواہ وہ مولوی ہو یا سرکاری دفتر کا ملازم بلا کسی روک ٹوک کے از خود پڑھ سکتا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ ہمارے ہاں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں، نہ ہی ہمارے ہاں کوئی پنڈتوں کا گروہ ہے اور نہ ہی اس قسم کا تصور کہ اس گروہ کے باہر باقی لوگ ذہنی طور پر اچھوت ہیں۔ میں اس پلیٹ فارم سے پوری جرأت اور وضاحت کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارے اور آپ کے تصور سے کہیں زیادہ مساوات کا حامی ہے۔

اب کرنے کا کام یہ ہے کہ اس ہزار سالہ عرصہ میں اسلام مستبد ملوکیت اور مفاد پرستانہ پیشوائیت کے جس ملبہ کے نیچے دب چکا ہے اسے وہاں سے نکالا جائے۔ جب وہ اسلام سامنے آئیگا تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا پیغام کس قدر صاف اور واضح انسانی حریت فکر اور تصور جمہوریت کے مطابق اور دنیا کے بلند ترین تصورات سے ہم آہنگ ہے۔

لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہی اسلام صحیح ہے جو آج ہم میں مروج ہے اور جو ہزار سالہ استبداد اور مفاد پرستی کی تخلیق ہے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اس قسم کی ملوکیت کے استبداد یا پیشوائیت کی خدائی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم حریت فکر و نظر کے قائل ہیں اور تمام انسانوں کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں یکساں مواقع بہم پہنچانے کے حامی ہیں ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں میں ان بلند اقدار کی روح پھونکیں جنہیں قرآن پیش کرتا ہے اور جن کے بغیر کوئی قیادت اخلاقی اور روحانی ترقی نہیں کر سکتی۔ (ڈان - ۲۹ اگست ۱۹۵۲ء)

ہم نے ان خیالات کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ محترم غلام محمد صاحب نے یہ تو فرمایا کہ ہمیں اصلی اسلام کو اس غیر اسلامی ملبہ کے نیچے سے نکالنا ہوگا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کے نکالنے کی شکل کیا ہوگی۔ اب بھی نہ تو انھوں نے اور نہ ہی محترم ملک صاحب نے یہ بتایا ہے کہ مملکت پاکستان سے ملائیت ختم کرنے کی عملی تدبیر کیا ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان میں جس دستور کی

سفارشات کی گئی ہیں اس میں تھیاکریسی کھلے طور پر موجود ہے اور ملاؤں کی جماعت کو عملاً اقتدارِ اعلیٰ کی پوزیشن دیدینے کی صورت اختیار کی جارہی ہے۔ سوال یہ سامنے آتا ہے کہ پاکستان کے گورنر جنرل اور اس کے ایک بہت بڑے صوبہ کے گورنر جس چیز کو اسلامی تعلیم کے خلاف اور مملکت کے لئے ایک بڑے خطرہ کا موجب سمجھ رہے ہیں ان کے نزدیک اس کے سدِّباب کی صورت کیا ہے؟ ہمارے ہاں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہمارے اربابِ قیادت واقتدار اس قسم کے خیالات کا اظہار تو کر دیتے ہیں لیکن اس باب میں کبھی کچھ نہیں کہتے کہ قوم کو عملاً کیا کرنا چاہیئے اور وہ خود اس کے متعلق کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جب تک ان امور کے لئے خود عملی قدم نہ اٹھائیں اور قوم کو عملی تدابیر نہ بتائیں اس قسم کے خیالات محض شاعری بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت صورت حالات یہ ہے کہ مملکت کے وزیرِ اعظم ان آئینی سفارشات کو عین مطابق اسلام قرار دے رہے ہیں جن میں پیشوائیت کو بڑی اہم حیثیت دی جارہی ہے اور اس کے برعکس اسی مملکت کے گورنر جنرل پیشوائیت کی اس حیثیت کو اسلام کی تعلیم کے خلاف قرار دے رہے ہیں۔ (اور ایسا قرار دینے میں وہ بالکل حق بجانب ہیں) محترم وزیرِ اعظم کی پوری پوری کوشش ہے کہ ملک کا دستور انہی سفارشات کے مطابق مرتب ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا دستور محترم گورنر جنرل کے خیال کے مطابق یکسر اسلام کے خلاف ہوگا۔ اب غور فرمائیے کہ مملکت پاکستان کے دو سب سے بڑے رکن ایک ایسے بنیادی مسئلہ میں ایسی متضاد آراء رکھتے ہیں۔ دونوں قوم کے نمائندے، بلکہ قائد ہیں۔ اور دونوں اپنے آپ کو اسلام کا محافظ اور ملت کا پاسبان خیال فرماتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب ان دونوں میں ایسے اہم بنیادی مسئلہ پر ایسا اختلاف ہے تو ملت کی یہ حیرت اور پریشانی بجا اور درست ہے کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

ہم محترم غلام محمد صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی پوری توجہ دیں اور اس کے بعد قوم کو بتائیں کہ مملکت پاکستان کو اس غیر اسلامی فتنہ سے بچانے کی عملی شکل کیا ہے اور وہ خود اس میں کہاں تک حصہ لینے پر تیار ہیں؟ اگر انھوں نے اس مسئلہ کو واضح کر دیا اور اس کے بعد اس کے عملی حصول میں ملت کی راہنمائی کی تو وہ اسلام اور مملکت پاکستان کی اتنی بڑی خدمت کر جائیں گے جس کی نظیر تاریخ میں بہ مشکل مل سکے گی۔ اور جسے ملت اسلامیہ کی آنیوالی نسلیں کبھی فراموش نہیں کریں گی۔ وہ یقین مانیں کہ مملکت پاکستان کا سنجیدہ طبقہ اس باب میں یکسر ان کے ساتھ ہے اور ان کی طرف سے عملی راہ نمائی کا منتظر ہے۔ اس وقت خود زمانے کے تقاضوں سے فضا بھی اس کیلئے سازگار ہے اور آنے والا مورخ صرف اتنا دیکھنے کا متمنی ہے کہ یہ سعادت کس کے حصہ میں آتی ہے۔ یقیناً یہ سعادت بہت بڑی ہے اور وہ شخص بڑا ہی خوش بخت ہوگا جسے یہ سعادت نصیب ہو جائے۔

رابطۂ باہمی

جنوری ۱۹۵۳ء کے طلوع اسلام میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ مختلف شہروں کے قارئین طلوعِ اسلام ایک دوسرے سے تعارف اور رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں ہمیں بہت سے احباب کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ سر دست تجویز یہ ہے کہ ان شہروں کے احباب جن کے نام نیچے دیئے گئے ہیں ان احباب سے ربط پیدا کریں جن کا پتہ ان شہروں کے سامنے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ احباب (جن کے نام نیچے لکھے گئے ہیں) ہمیں مطلع فرمائیں کہ ان سے کتنے احباب نے رابطہ پیدا کیا ہے ہم اس کے بعد عرض کرینگے کہ اس رابطۂ باہمی کو مفید بنانے کی کیا شکل اختیار کی جائے۔ واضح رہے کہ یہ روابط قرآنی مسائل کو سمجھنے اور قرآنی فکر کو عام کرنے کی غرض سے ہوں گے اس لئے ان میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق حضرات شریک ہو سکتے ہیں۔

نوٹ :۔ ہمیں افسوس ہے کہ ناظرین طلوع اسلام نے رابطۂ باہمی کی اہمیت کو کماحقہ محسوس نہیں کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری یہ برادری آئندہ کسی تساہل یا تغافل سے کام نہ لیگی۔

کراچی ——— ناظم ادارۂ طلوع اسلام ۔ بندر روڈ ۔ کراچی

لاہور ——— ناظم دارالقرآن ۔ نسبت روڈ ۔ لاہور

پشاور ——— ڈاکٹر عبدالغفور قریشی صاحب ۔ نمک منڈی پشاور شہر

مردان ——— ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب ۔ دکان ڈاکٹر نواب علی انور علی کیمسٹ ۔ بنک روڈ ۔ مردان

رحیم یار خاں ——— غلام کبریا ملک ۔ معرفت سید ذاکر حسین صاحب ایڈووکیٹ رحیم یار خاں ۔ ریاست بہاولپور

میرپور خاص ——— مسٹر محمد عبدالرحیم یوسفانی صاحب ایڈووکیٹ ۔ نیو ٹاؤن ۔ میرپور خاص ۔

مظفر گڈھ خاص ——— عبدالغفور صاحب چغتائی ۔ ڈسٹرکٹ سولجرز بورڈ ۔ مظفر گڈھ

علی پور ضلع مظفر گڈھ ۔ ملک غلام فرید صاحب اے آر او ۔ علی پور ۔ ضلع مظفر گڈھ

کوٹ ردو ضلع مظفر گڈھ ——— زبدۃ الحکماء حکیم محمد عبداللہ خاں صاحب زمزم شفاخانہ ۔ کوٹ ردو ۔ ضلع مظفر گڈھ

جذبۂ صدیقؓ

مذہب میں نکتہ سنجی و تدقیق چاہیئے
دیں کے لئے تو جذبۂ صدیقؓ چاہیئے

دیں کے معاملے میں اطاعت ہے ناگزیر
مذہب کے مسئلے ہوں تو تحقیق چاہیئے

کافی نہیں زبان سے اور دل سے ماننا
ایمان کی عمل سے بھی تصدیق چاہیئے

حُسنِ عمل کی سعی ضروری تو ہے مگر
اس کے لئے خدا سے بھی توفیق چاہیئے

دل سے ادا ہوں خالق و مخلوق کے حقوق
پیشِ نگاہ مقصدِ تخلیق چاہیئے

آئینِ مُلک و دیں میں رہے اختلاف کیوں
دونوں میں ہر لحاظ سے تطبیق چاہیئے

مانا کہ صلحِ کُل ترا مسلک ہے اے اسدؔ
پھر بھی تمیزِ مومن و زندیق چاہیئے

اسدؔ ملتانی

قرآنی فیصلے

پہلے ان عنوانات کو غور سے دیکھئے

(۱) نماز
(۲) نمازوں کی تعداد اور رکعتیں وغیرہ
(۳) زکوٰۃ
(۴) صدقہ وخیرات
(۵) قربانی
(۶) غلامی
(۷) ایصال ثواب
(۸) تلاوت قرآن
(۹) ترکہ اور وصیت
(۱۰) قانون وراثت
(۱۱) اوقاف
(۱۲) ماں باپ کی اطاعت
(۱۳) نکاح نابالغاں
(۱۴) تعدد ازواج
(۱۵) زمانۂ عدت
(۱۶) عورتوں کو مارنا
(۱۷) شرعی سزائیں
(۱۸) شراب کا استعمال
(۱۹) سنگساری کی سزا
(۲۰) قرآن میں آیۂ رجم
(۲۱) قمار بازی
(۲۲) شب برات
(۲۳) عید میلاد کی مجلسیں
(۲۴) کیا حضور کا سایہ نہ تھا؟
(۲۵) رسولؐ اللہ اور علم غیب
(۲۶) حفاظتِ قرآن
(۲۷) اسلامی تاریخ کی حقیقت
(۲۸) ناسخ ومنسوخ
(۲۹) قرآن فہمی کا طریق
(۳۰) عجمی اسلام کیا ہے
(۳۱) تصویر کے متعلق حکم
(۳۲) قرآن اور آرٹ
(۳۳) ہماری ملی تقاریب
(۳۴) مشاعرے
(۳۵) موت کے بعد کی زندگی۔
(۳۶) عذابِ قبر
(۳۷) انسانی ارتقاء
(۳۸) آدم سے کیا مراد ہے؟
(۳۹) قومی ملکیت
(۴۰) انفرادی ملکیت
(۴۱) مہاجرین کے مسئلہ کا حل
(۴۲) نوع انسانی کی عالمگیر برادری
(۴۳) کیا انسان خدا کا نائب ہے؟
(۴۴) نوجوانوں کے دل کی دھڑکن۔

اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ ان تمام مسائل کے متعلق قرآن کا فیصلہ کیا ہے تو آپ کی کتنی بڑی مشکل آسان ہو جائیگی۔ ادارۂ طلوع اسلام آج کل ایک ایسی کتاب تیار کر رہا ہے جس میں ان تمام مباحث کا جواب قرآن سے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا نام ہے

قرآنی فیصلے

یہ طے کرنے کے لئے کہ کتاب کتنی تعداد میں چھپوائی جائے آپ اپنی ضرورت سے ہمیں جلدی مطلع فرمائیے۔ یہ کتاب اندازاً چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی اور اسی کے مطابق اس کی قیمت کا اندازہ بھی چار پانچ روپے کے لگ بھگ ہوگا۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ بندر روڈ۔ کراچی

نقد و نظر

ایک اسلام

دگر از سر گرفتم قصۂ زلف چلیپا را

علامہ اقبالؒ نے مثنوی اسرار و رموز میں (عالمگیر اورنگ زیبؒ کے ایک واقعہ کے ضمن میں) لکھا ہے:

تخم الحادے کہ اکبر پرورید　　باز اندر فطرتِ دارا دمید

یعنی الحاد کا وہ تخم کہ جسے اکبر نے بویا اور اس کی آبیاری کی اور اس کے بعد وہ دارا شکوہ کی فطرت میں برومند ہوا، ایک ایسے فتنہ کا موجب تھا جس سے

شمع دل در سینہ ہا روشن نبود　　ملتِ ما از فساد ایمن نہ بود

یہ الحاد جس کی تخم ریزی اکبر نے کی تھی یہ نظریہ تھا کہ اسلام کو دیگر مذاہب عالم پر کوئی افضلیت حاصل نہیں۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف الفاظ و اصطلاحات اور اشکال و صور کا ہے۔ اصل سب کی ایک ہے اسلئے کوئی مسلمان ہو تو کیا اور ہندو ہو تو کیا، اپنے اپنے طور طریقے پر خدا کی پرستش کرلی جائے اور نیک کام کئے جائیں تو سب کی نجات ہو جاتی ہے۔

اکبر نے جن سیاسی محرکات کی بنا پر اس نظریہ کو عام کیا تھا وہ تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں، لیکن اس کی زد صرف سیاسی مقاصد ہی پر نہیں پڑتی تھی بلکہ اس سے شجرِ اسلام کی جڑ کٹ جاتی تھی۔ یہی وہ تصور تھا جسے دارا شکوہ نے تصوف کے نقاب میں آگے بڑھایا اور اپنی شطحیات میں "ہمہ اوستی" انداز میں اس خیال کو عام کیا کہ رام اور رحیم ایک ہی حقیقت کے مظاہر ہیں — جسا ایک، گھاٹ بہتیرے — یہ تھا وہ فتنۂ عظیم جس کا استیصال امام سرہندیؒ اور عالمگیر اورنگ زیبؒ کی مساعیِ جمیلہ سے ہوا۔ عالمگیر کی اسی سعیِ حسنہ کی بنا پر اسے اقبالؒ کے ہاں سے

ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

کی ممتاز سند عطا ہوئی اور امام سرہندیؒ کی عظمت حریمِ قلوب کے اندر جاگزیں ہے۔

یہی خیال ہندی فقیروں کے مختلف گروہوں — مثلاً کبیر پنتھی، سورداس وغیرہ — کے ہاں عام ہوتا رہا، اور راجہ رام موہن رائے نے اسی کو ایک منظم شکل میں برہمو سماج کے نام سے پیش کیا۔ چونکہ ان کا تخاطب خصوصی مسلمانوں سے نہیں تھا اس لئے یہ کوششیں اسلام کیلئے کسی خاص خطرہ کا موجب نہ بنیں۔ لیکن جب اسے ابوالکلام آزاد نے اپنے پورے زورِ خطابت کے ساتھ اپنے تفسیری ترجمہ

(ترجمان القرآن جلد اول) میں پیش کیا تو یہ چیز ایک واقعی خطرہ کا موجب بن گئی۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے انہی کی تفسیر کو بنیاد قرار دیکر اپنی خاص تعلیمی اسکیم مرتب کرائی جو "وارد ھا کی تعلیمی اسکیم" کے نام سے منصۂ شہود پر آئی۔ یہ اسکیم بھی ایک مسلمان (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب) کے نام کے ساتھ باہر آئی۔ تجویز یہ تھی کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام بچوں کو (جن میں مسلمانوں کے بچے بھی شامل تھے) اسی نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ اسکیم کامیاب ہو جاتی تو ایک دو نسلوں کے بعد تمام مسلمان برہمو سماجی ہو جاتے اور وہی الحاد جس کی تخم ریزی اکبر نے کی تھی اور جو "شطحیات دارا" کی فضاؤں میں بار ور ہوا تھا ایک عملی نظام کی حیثیت سے مسلمانوں پر چھا جاتا۔

اکبر اور دارا کی ان شئوم کوششوں کے استیصال کے لئے اللہ تعالیٰ نے امام سرہندیؒ اور عالمگیر جیسی ہستیوں کو کھڑا کر دیا اور ہمارے اس دور میں اس فتنہ کی سرکوبی کی سعادت جناب پرویز اور ان کی وساطت سے طلوع اسلام کے حصہ میں آئی۔ ابوالکلام صاحب آزاد کی مذکورہ صدر تفسیر کا استقبال نہایت جوش و خروش سے ہوا اور اس عقیدت مندی کی بنا پر جو مسلمانوں کو (دور الہلال کے) ابوالکلام سے پیدا ہو چکی تھی اسے آنکھوں سے لگایا اور سروں پر اٹھایا گیا۔ لیکن مدح اور ستائش کے اس عالمگیر ہجوم اور تعریف و توصیف کے ان فلک بوس غلغلوں میں جناب پرویز کی قرآنی بصیرت تھی جس نے اس فتنہ کو بھانپا اور پوری جرأت اور بے باکی سے "قلم کے اس شہنشاہ" کی سحر آفرینیوں کو بے نقاب کر دیا۔ چنانچہ ان کی تنقید نے جو مجلہ معارف میں شائع ہوئی تھی نگاہوں کا رُخ بدل دیا۔ اس کے بعد جب وارد ھا اسکیم کا طوفان اٹھا ہے تو اس کے خلاف طلوع اسلام نے ایسا محاذ قائم کیا جسے وہ احباب اچھی طرح سے جانتے ہیں جو اس زمانہ میں ان مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کی وسعتوں کا اس سے اندازہ لگائیے کہ اس کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کا قریب پانچ چھ زبانوں میں ترجمہ ہوا اور صرف اردو پمفلٹ قریب ایک لاکھ کی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ اللہ کی توفیق نے یاوری کی اور وہ فتنہ فرو ہوا۔

تشکیل پاکستان کے بعد اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اکبری الحاد کی شاخ یہاں بھی پھوٹے گی لیکن ہمیں یہ دیکھکر افسوس ہوا کہ ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق نے اپنی (زیر نظر) کتاب "ایک اسلام" میں اس سوئے ہوئے فتنہ کو پھر جگا دیا۔ یہ کتاب "کتاب منزل" کشمیری بازار لاہور" کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

برق صاحب نے اس سے پہلے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "دو قرآن"۔ وہ کتاب خاصی مقبول ہوئی اس لئے کہ اس میں (علاوہ نام کی جدت کے) اشیاء فطرت کے رموز و غوامض کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا "دو اسلام"۔ اس میں انھوں نے روایات پر کڑی تنقید کی تھی۔ ہمیں یہ دیکھکر افسوس ہوا تھا کہ اس تنقید میں ان کے انداز میں سوقیانہ پن آ گیا تھا اس لئے وہ کتاب علمی سطح سے نیچے گر گئی تھی۔ اب انھوں نے زیر نظر کتاب میں اسی ابوالکلامی مسلک کا اعادہ کیا ہے کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں اور اسلام کو دیگر مذاہب پر کوئی افضلیت حاصل نہیں۔ وہ اس باب میں آزاد صاحب سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں کے پاس جو کتابیں اس وقت موجود ہیں وہ وہی ہیں جو ان کے انبیاء کو خدا کی طرف سے ملی تھیں اور ان میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی۔ اس لئے جس طرح قرآن انسانی دست برد سے محفوظ رہا ہے اسی طرح وہ کتابیں بھی بجنسہٖ محفوظ چلی آ رہی ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ جب خدا کی

وحی ہر کتاب میں اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اور وہ وحی اسی خدا کی طرف سے آئی تھی جس خدا کی طرف سے قرآن آیا ہے تو پھر اسلام کیلئے وجہ فوقیت کیا ہے۔ یہ ہے وہ دعویٰ جو قریب چار سو صفحہ کی اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

چونکہ ہمارے نزدیک یہ سوال بڑا بنیادی ہے اور یہ نظریہ ایک عظیم خطرہ کا موجب اسلئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے متعلق تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک اس کیلئے اس سے بہتر صورت اور نہیں ہو سکتی کہ محترم پرویز صاحب کے اس مقالہ کو دوبارہ شائع کر دیا جائے جس میں انھوں نے ابوالکلام صاحب آزاد کے اس مسلک پر تنقید کی تھی۔ چنانچہ یہ مقالہ لفظی تغیرات اور مختصر حک و اضافہ کے ساتھ آئندہ صفحات میں آپکے سامنے آجائیگا۔ اس مقالہ میں برق صاحب کے اس دعوی کا تفصیلی جواب نہیں ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کی آسمانی کتابیں غیر محرف ہیں اس دعوی پر وہی مثل صادق آتی ہے کہ مدعی سست گواہ چست، ان مذاہب کے مفکرین، مورخین حتی کہ مذہبی راہنماؤں تک کھلے کھلے الفاظ میں اعتراف اور اعلان کر رہے ہیں کہ ہماری مزعومہ آسمانی کتابیں قطعاً غیر محرف نہیں ہیں۔ لیکن ان سب کے خلاف برق صاحب فرما رہے ہیں کہ تمہیں کیا پتہ ہے۔ یہ ہم سے پوچھو۔ تمہاری سب کتابیں لفظاً لفظاً وہی ہیں جو آسمان سے اتری تھیں۔ اس امر کی تفصیل (کہ ان کتابوں کی تاریخی حیثیت کیا ہے اور خود ان مذاہب کے نمائندے کس طرح اعتراف کر رہے ہیں کہ یہ کتابیں غیر محرف نہیں ہیں) محترم پرویز صاحب کی مایۂ ناز تصنیف معراج انسانیت کے پہلے باب "ظہر الفساد فی البر والبحر" میں ملیگی جو قریب پونے دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور بڑی تحقیق سے لکھا گیا ہے اس کے بعد اس موضوع پر کچھ اور لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات بڑی دلچسپ ہے۔ برق صاحب عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم سے بھی خاصے متاثر ہیں۔ سندھی صاحب نے لکھا ہے کہ ہماری کتب احادیث کی پوزیشن عیسائیوں کی اناجیل کی سی ہے۔ برق صاحب نے اپنی کتاب "دو اسلام" میں یہ کہا ہے کہ حقیقی اسلام صرف قرآن کے اندر ہے اور احادیث کا پیش کردہ اسلام باطل اور گمراہ کن ہے لیکن وہ اپنی زیر نظر کتاب "ایک اسلام" میں یہ دعوی کر رہے ہیں کہ جو اسلام اناجیل میں ملتا ہے اس میں اور قرآن کے اسلام میں کوئی فرق نہیں۔ اب اگر حدیث پرست حضرات ان پر یہ اعتراض کریں کہ جب اناجیل میں پیش کردہ اسلام وہی ہے جو قرآن میں ہے تو احادیث میں پیش کردہ اسلام قرآن کے اسلام سے کس طرح مختلف قرار پا جائے گا۔

برق صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمان ان کے پیش کردہ مسلک کو اختیار کر لیں تو دیگر اقوام عالم ان کی دشمنی اور عداوت نہیں برتے گی۔ اور اس طرح دنیا میں امن قائم ہو جائیگا۔ برق صاحب کی قیام امن کی یہ خواہش کیسی ہی مقدس اور معصوم کیوں نہ ہو لیکن اول تو وہ یاد رکھیں کہ دنیا کا امن اس سے بھی قائم نہیں ہو سکیگا اور اگر بفرض محال اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس سے مختلف اقوام کے جذبات تعصب فرو ہو جائیں گے تو وہ اس سے بھی ایک قدم آگے کیوں نہیں بڑھتے اور سرے سے مذہب کو دنیا سے مٹانے کی دعوت کیوں نہیں دیتے کیونکہ دنیا کی عام آواز یہ ہے کہ دنیا میں تمام فسادات کی جڑ مذہب کا وجود ہے۔

مذکورہ بالا عمدی نکتہ کے علاوہ اس کتاب میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو اسلام کے تصور زندگی کے خلاف ہیں لیکن اس تبصرہ میں کس کس بات کو سامنے لایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس کتاب کو دیکھکر بڑا رنج پہنچا کہ برق صاحب اپنی عمر کے اس حصہ میں بھی علم اور جہالت اور سنجیدگی اور بچپن میں تمیز ہی نہیں کر سکے۔ ہمارا ان کیلئے نہایت مشفقانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ اس کتاب کی اشاعت کو فوراً روک دیں تاکہ قوم اس مصیبت سے بچ جائے اور وہ اضحوکہ بننے سے۔

اب آپ محترم پرویز صاحب کا وہ مقالہ ملاحظہ کیجئے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یہ مقالہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

پرویز

[اس کے پڑھنے سے پہلے، گذشتہ صفحات کا تبصرہ ملاحظہ فرمالیجئے۔ طلوعِ اسلام]

کچھ عرصہ سے دنیائے مذاہب میں ایک خاص رسم سی پیدا ہوگئی ہے۔ مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں جن میں مختلف ادیانِ عالم کے نمایندے اپنے اپنے مذہب کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ ان تقاریب سے مقصد بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اہلِ مذاہب ایک دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں اور یوں اُن غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجائے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اگرچہ اس مقصد کی عمدگی اور ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میں نے جب کبھی ان اجتماعات کی روئداد کو پڑھا مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان میں (کم ازکم) اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام امن و سلامتی کا پیغامبر اور نوعِ انسانی کے لئے آیۂ رحمت ہے۔ اس لئے اس میں غیر مذاہب سے رواداری حُسنِ سلوک اور وسعتِ نظر کی تعلیم عام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام، دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ایک خاص افضلیت کا مدعی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں آج صرف قرآن کریم کے اندر ہے جو خدا کا آخری پیام اور ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو قیامت تک کے لئے انسانی زندگی کی ہر شاخ میں قانونِ فطرت کے مطابق ہدایت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان اجتماعات میں اسلام کی وسعتِ نظر، کشادگی ظرف، رواداری، حُسنِ سلوک کا چرچا تو عام کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی اس خصوصیت، یعنی اس کی افضلیت و اکملیت، برتری اور فوقیت کے متعلق ایک حرف زبان تک نہیں لایا جاتا۔ کیونکہ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس طرح دیگر اہلِ مذاہب کی دلشکنی ہوگی اور وہ اسلام کے نمایندہ کو "متعصب اور تنگ نظر" خیال کریں گے۔ لہٰذا رواداری اور کشادہ نگہی کے اس غلط مفہوم سے متاثر ہوکر اسلام کے نمایندوں کو اسلام کی صحیح ترجمانی کا حوصلہ نہیں پڑتا اور وہ ان اجتماعات میں کچھ ایسے سمٹے سمٹائے، جھجکتے لجاتے ہوئے آتے ہیں

چو زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

اس نقطۂ خیال سے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس قسم کی کانفرنسیں کسی بہتر نتیجہ کی طرف منجر نہیں ہوتیں۔ بلکہ میں تو ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ چیز بجائے فائدے کے نقصان کا باعث ہو رہی ہے۔ ان اجتماعات کے انعقاد سے یہ مقصد ہو یا نہ ہو، لیکن ان کا نتیجہ یقیناً یہی مرتب ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کو پسِ پشت ڈال کر اسے دوسرے مذاہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ واقعات آہستہ آہستہ بتا رہے ہیں کہ یہ خدشہ موہوم اور یہ احتمال قیاسی نہیں۔

۱؎ اسلام کے لئے "مذہب" کا لفظ دوسروں سے تقابل کی خاطر لکھ دیا گیا ہے۔ ورنہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔

اوائل جون ۱۹۴۱ء میں شولاپور کے مقام پر اسی قسم کی ایک "تمام مذاہب کی کانفرنس" منعقد ہوئی۔ جس کے صدر ہندو قوم کے مشہور کارکن پنڈت سندرلال جی تھے۔ اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندوں نے جو کچھ کہا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ جناب صدر نے اپنے خطبہ میں پورا زور اس بات کے ثابت کرنے میں لگا دیا کہ اسلام خود تسلیم کرتا ہے کہ نجات و سعادت کی راہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اصل مذہب "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی ہے اور یہ اصل ہر مذہب میں موجود ہے۔ فرق صرف شرع و منہاج (یعنی فروعات) میں ہے۔ اور یہ فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ پنڈت جی نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا بلکہ شروع سے اخیر تک جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اول) سے شرح و بسط سے اقتباسات پیش کر دیئے جن سے حرفاً حرفاً ان کے دعوے کی تائید ہوتی تھی (آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا اور پنڈت جی نے اپنے خطبہ میں اس کا حوالہ پیش کیا ہے۔ مجھے نہ تو ان امیال و عواطف سے کچھ بحث ہے جو اس تفسیر کے محرک ہوئے اور نہ ان مقاصد سے واسطہ جو اس کے ہندی ترجمہ اور اس کی عام اشاعت سے پیش نظر ہیں۔ مجھے تو قرآن کریم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات قرآن کریم کی رو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اس سے پیشتر بھی مجملاً بہت کچھ لکھا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر تفصیلی طور پر لکھا جائے تاکہ ان خیالات کو عام کرنے والے یہ کہہ کر فریب خوردگی اور فریب دہی کے مرتکب نہ ہو سکیں کہ اسلام خود اس تعلیم کا مؤید ہے۔

اس تفصیلی بحث کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب یہ محسوس کیا جائے کہ ہمارے نوجوان طبقہ پر اس تعلیم کا کیا اثر پڑ رہا ہے: "تمام مذاہب یکساں ہیں، عالمگیر سچائیاں سب میں ایک جیسی ہیں۔ خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی نجات و سعادت کی ضامن ہے۔ ہدایت خدا کی رحمت ہے جو کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہو سکتی"۔ وغیرہ وغیرہ خیالات ایسے نظر فریب اور خوش آئند ہیں کہ سطح بین نگاہیں فوراً اس سحر سے مسحور ہو جاتی ہیں۔ اور جب اس سطحی کشش و جاذبیت کو جناب آزاد جیسے مفسرِ قرآن کی تائید بھی حاصل ہو جائے تو اس سحر کے سحرِ حلال بن جانے میں کون سی شئے مانع ہو سکتی ہے؟

رواداری کے اس نظر فریب مفہوم اور وسعتِ نگاہ کی اس سراب آسا تفسیر کی پہلی جھلک ہمیں شہنشاہ اکبر کے دین الٰہی میں ملتی ہے۔ جس طرح وہ جذبات و مقاصد جو اس تحریک کے محرک تھے تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں اسی طرح وہ مساعیِ جمیلہ بھی ان کی نگاہوں سے مستور نہیں جو اس اسلام سوز نظریہ کے ابطال و استیصال کیلئے مجاہدانہ انداز سے معرضِ وجود میں آئیں۔

برہمو سماج فرقہ کی تحریک بھی قریب قریب انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھی لیکن چونکہ یہ تحریک مسلمانوں کی طرف سے وجود میں نہیں آئی اس لئے وہ ہمارے دائرۂ تنقید سے باہر ہے۔

اس کے بعد یہی نظریہ موجودہ سیاسی کشمکش کے طوفان میں سطح کے اوپر لایا گیا۔ اس نظریہ کی اشاعت کی موجب جناب آزاد کی تفسیر ہوئی اور اس طرح سے یہ چیز مسلمانوں میں دین کی حیثیت سے پھیل گئی۔ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالم دین اور مفسر

کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر تھا۔ اس لئے اس تفسیر کا ایک عرصہ سے انتظار ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا۔ لوگوں نے اسے آنکھوں سے لگایا، سر پر اٹھایا اور مختلف گوشوں اور متنوع حلقوں سے اس کی تعریف و توصیف میں غلغلہ انداز نعرے بلند ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جناب آزاد کے ترجمہ میں ایک خصوصیت ضرور ہے جس کی تعریف نہ کرنا بخل ہوگا۔ لیکن بحث تو ان کے اس نظریہ سے ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے چنانچہ ہوا یہ کہ کتاب کی اشاعت کے زمانہ میں دفورِ شوق اور جوشِ عقیدت کے اس والہانہ ہجوم میں کسی کی نگاہ اس طرف نہ اٹھی۔ برنگِ خود بینی نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس ازدحامِ مدح و ستائش میں یہ توفیق اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو عطا فرمائی کہ جناب آزاد اور اہلِ نظر طبقہ کی توجہ اس بنیادی غلطی کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس تفسیر کے ذریعہ سے عام ہونے والی تھی چنانچہ مجلہ معارف (بابت جنوری ۱۹۳۳ء) میں میرا وہ مضمون شائع ہوا جس میں تفسیر کے اس حصہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی تھی۔ اس مضمون کو اربابِ نظر کے حلقہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے بعد مختلف گوشوں سے اس نظریہ کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں۔ اس واقعہ کو آٹھ نو برس ہو چکے ہیں چونکہ وہ تنقیدی مضامین جو اس نظریہ کے خلاف شائع ہوئے تھے لوگوں کی نگاہوں سے وقتی طور پر گذرے اس لئے ان کی یاد محو ہوتی گئی (متفرق مضامین کا اثر ہو تا بھی وقتی ہے) اور تفسیر چونکہ مستقل کتاب کی شکل میں ہے اس لئے وہ ہر وقت سامنے رہی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی اس نظریہ کا چرچا عام ہونے لگا میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ تین برس ادھر سے کبھی کبھار مجلہ طلوعِ اسلام میں بھی اس کا تذکرہ چھڑتا رہا لیکن بایں ہمہ، یہ وقتی کوششیں ایک مستقل تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ انھیں پے تسلسل جاری نہ رکھا جائے، بالخصوص جبکہ اس نظریہ کی اشاعت میں غیر مذاہب کے لوگ بھی کوشاں ہوں۔ میرے نزدیک اسلام کے لئے یہ نظریہ بہت بڑا خطرہ اپنے اندر رکھتا ہے اس لئے کہ جب آپ ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیں کہ اسلام میں دیگر مذاہب کے مقابلہ میں کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت نہیں تو اس کے بعد اسلامی نظامِ زندگی سے شیفتگی اور اس کی سرفرازی کے لئے آرزوئیں اور کوششیں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی تمام سیاسی جدوجہد، جسے اسقدر اہمیت حاصل ہے، بھی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ قوموں کی زندگی کا راز اُن کے عقیدہ (نصب العینِ حیات) سے وابستہ ہے۔ جس قدر کسی قوم کا مطمحِ نگاہ (عقیدہ) بلند اور اس کے افراد کو جسقدر اس سے عشق ہوگا، اتنی ہی وہ قوم زندگی کی دولت سے بہرہ یاب ہوگی۔ نظریۂ حیات (عقیدہ) کی ایک ذرا سی غلطی قوم کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ گاڑی جب کانٹا بدلتی ہے تو دونوں لائنوں میں انچ بھر کا غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے۔ لیکن اس کانٹا بدلنے میں اگر ایک نمبر کی بھی غلطی ہو جائے تو تھوڑے عرصہ کے بعد وہ گاڑی نہ صرف اپنی منزل ہی سے کوسوں دور ہو جائے گی بلکہ اسے ہر قدم پر ہلاکت اور تباہی کا سامنا ہوگا۔ میرے نزدیک جناب آزاد کا نظریہ ایک ایسی ہی ہلاکت آفرین غلطی ہے جو اگر بدستور قائم رہی تو نہ معلوم کسی وقت کیا رنگ لا کر رہے یہی وہ احساس ہے جو مجھے بار بار اس موضوع پر لکھنے کیلئے آمادہ کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب! آجکل دوسرے مذاہب کے پیرو اس روش پر آرہے ہیں کہ وہ اپنے ہی مذہب، کو سب سے اعلیٰ و ارفع نہیں

بتلاتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا مذہب بھی باقی مذاہب جیسا ہے۔ اس طرح سے وہ رنگ خود بخود بدل رہا ہے جس میں مباحث و مناظرات کے اکھاڑے قائم ہوا کرتے تھے اور ہر مذہب والا اپنے مذہب کی اولیت و افضلیت ثابت کرنے میں نبرد آزمائی کرتا تھا۔ دوسرے مذاہب والوں کا تو یہ مسلک ہے اور ادھر یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو پھر اسی مقام پر پہنچ جانے کی تلقین کی جا رہی ہے! اس میں شبہ نہیں کہ ناروا بحث و جدل عمدہ نتائج کی حامل نہیں ہوتی اور میں اس سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن معترض حضرات ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کیا فرما رہے ہیں؟ جس چیز کو وہ دیگر اہلِ مذاہب کی وسعتِ نگاہ اور مسلمانوں کی تنگ نظری قرار دے رہے ہیں، اس کی اصلیت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ (مثلاً) زید کا ایک بچہ ہے بڑا غبی اور نالائق۔ عمر کا ایک بچہ اس کے مقابلہ میں بڑا ذکی اور ذہین ہے۔ زید ہر مقام پر کہتا پھرتا ہے کہ صاحب! میں تو کبھی یہ نہیں کہتا کہ میرے بچہ کو کوئی خاص افضلیت حاصل ہے۔ میرے نزدیک تو میرا اور عمر کا بچہ بالکل یکساں ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تو عمر کی خود ستائی ہے کہ اپنے بچہ کے برابر کسی اور کو سمجھتا ہی نہیں!

فرمائیے کہ یہ اصول زید کی وسعتِ نظر اور عمر کی تنگ دامنی کا آئینہ دار ہے یا کسی اور حقیقت کا غماز؟ دورِ حاضر میں زمانے کے تقاضوں سے ہوا یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام ادیان کو دقت پیش آ رہی ہے کہ نہ ان کے معتقدات علم و عقل کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں نہ ان کے اصول و ضوابط انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور گوناگوں مقتضیات کے لئے کوئی حل پیش کر سکتے ہیں چنانچہ انھیں آئے دن اپنی عملی ضروریات کے لئے اِدھر اُدھر سے اصول و قوانین مستعار لینے پڑتے ہیں۔ اس لئے وہ مذاہب انسان کی برق رفتار ترقی کا ساتھ دینے سے قطعاً قاصر ہیں۔ رفتہ رفتہ ان مذہب کے ماننے والوں کی حالت یہ ہوتی جا رہی ہے کہ انھیں نہ اپنے عقائد پر یقین رہا ہے اور نہ ہی اپنے مذہب سے وابستگی۔ وہ مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور ان کی یہ برگشتگی بعض صورتوں میں سرکشی اور بغاوت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ قوم کی زندگی کا راز عقائد سے وابستگی میں مضمر ہے۔ اس لئے ان مذاہب کے اربابِ حل و عقد کو خطرہ ہے کہ کہیں اس طرح رفتہ رفتہ یہ شیرازہ ہی منتشر نہ ہو جائے اس کے مقابلہ میں وہ خود دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دیتا ہے۔ انھیں خطرہ ہے کہ ان حالات کے پیشِ نظر ان کے مذہب کے پیروؤں کا سمجھدار طبقہ اسلام کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ ان حالات کے ماتحت وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے اپنے مذہب گزیدہ نوجوانوں سے یہ کہنا کہ ان کا مذہب تمام مذاہبِ عالم سے اعلیٰ و افضل ہے، کسقدر بے نتیجہ اور بے معنی ہے۔ اس لئے انھوں نے اس خطرہ سے بچنے کی وہی راہ نکالی ہے جو زید نے اپنے بچہ کے متعلق اختیار کی تھی۔ انھوں نے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ اگر ان کا مذہب اتنا اونچا نہیں جا سکتا جہاں اسلام ہے تو یہی کیا جائے کہ اسلام کو اس کی سطح سے نیچے اتار کر اپنے مذہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جائے۔ اور اس طرح ان کے اپنے مذہب سے برگشتہ ہونے والوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ مذاہب سب ایک جیسے ہیں اس لئے اپنے مذہب سے یہ سمجھکر بیزار نہ ہو جائیے کہ اس سے بہتر مذہب بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ مذہب کا دائرہ پرستش اور عبادت تک محدود ہے۔ اس اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ باقی رہا نظامِ زندگی سو وہ مذہب سے الگ شے ہے، اسے قوم کی اجتماعیت تشکیل دیتی ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے قومیت ہی وہ نقطہ ہے جس سے متمسک رہنے میں رازِ حیات ہے۔ ان زیرک حضرات نے اس طرح اس آنے والے خطرہ سے اپنی قوم کو بچا لیا ہے یعنی اپنے مذہب کی

کمزوری کو "وحدتِ ادیان" کے نقاب میں چھپالیا اور قوم کی اجتماعیت کے لئے ایک دوسرا محاذ (قومیت) تلاش کرلیا۔

یہ ہیں وہ مقتضیات و عواطف جن کے ماتحت "یکسانیتِ مذاہب" کی یہ تحریک وجود کوش ہوئی ہے۔ آپ مختار ہیں کہ اس کا نام جوجی میں آئے رکھ لیجئے۔ لیکن ذرا اس کی کیفیتِ قلب کا بھی تو احساس کیجئے جو یہ ماننا ہو کہ یہ زمانہ آنا تھا جس میں تمام مذاہب والے اپنے اپنے مذہب کے ناقص ہونے کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں۔ یعنی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات انھیں اس امر کے اعتراف پر مجبور کردیں کہ ان کا مذہب واقعی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دیسکتا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسلام کے دینِ حقیقی ہونے کا دعویٰ علیٰ وجہ البصیرت دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکتا اور یوں اس کی افضلیت و اکملیت کا اقرار لیا جاسکتا تھا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں قرآن کے اس دعوے کو ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آنا تھا کہ

هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِۦ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ○

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ حیات اور نظامِ حقیقی دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے، خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

جو شخص قرآن کی اس حقیقت کبریٰ پر ایمان رکھتا ہو کہئے کہ جب وہ دیکھے کہ عین اس زمانہ میں خود اسلام کے نام لیواؤں کی طرف سے یہ نظریہ پیش ہو رہا ہے کہ "تمام مذاہب یکساں ہیں" تو وہ کس طرح اس عقیدہ کو مبنی علی الحقیقت اور اس کی اشاعت کو خدمتِ اسلام قرار دے لے؟

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم یہ دعویٰ کروگے کہ ہمارا مذہب تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور نجات و سعادت اس سے باہر اور کہیں نہیں تو اسی قسم کا دعویٰ دوسرے اہلِ مذاہب بھی کرنے لگ جائیں گے اور پھر وہی تقابل و توازن کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ سوال تو اب مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دن گئے جب نظری مسائل کی بنا پر مباحثات و مناظرات کی بزم آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ ساری دنیا اپنے اپنے نظریاتِ زندگی سے تنگ آچکی ہے اور انھیں تلاش ہے کہ کہیں سے ایسا نظریۂ حیات مل جائے جس کے ماتحت انسان امن و سلامتی کی زندگی بسر کرسکے۔ جن اقوام نے **قومیت** کو امن و سکون ضامن کا بنایا تھا، وہ اب محض

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کے مطابق طوعاً و کرہاً نباہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں تقابل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اب تو صرف صحیح اسلام کو اجاگر کرنے کی دیر ہے تشنہ لب دنیا خود بخود اس چشمۂ حیات کے گرد جمع ہو جائے گی۔ لیکن اگر مقابلہ کے سوال کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو بھی مقابلہ سے گھبراتا کون ہے؟ عمر کے لئے تو یہ چیلنج نویدِ مسرت ہے کہ اس کے اور زید کے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں بٹھا دیا جائے۔ اگر دنیا پوچھنا چاہتی ہے تو بڑی خوشی سے پوچھ لے۔ ہم بتائیں گے کہ ان کے نظریاتِ زندگی کہاں کہاں اور کیوں ناکام رہے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کون سا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے جو ان تمام اسقام و عیوب سے پاک ہے۔ لیکن اس وقت میرا مخاطب غیر مذاہب والوں سے نہیں۔ اس وقت میں صرف انھیں مخاطب کرنا چاہتا ہوں جو مسلمان کہلانے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اس تخصیصِ تخاطب

مقصد یہ ہے کہ ہم اس نظریہ کو قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھیں گے۔ غیر مذاہب والوں سے بات کرنے میں طریقِ استدلال اس سے مختلف ہوجاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن حجت نہیں ہوتا۔ لہٰذا میرا تخاطب ان سے ہے جو قرآن کو حجت مانتے ہیں۔ لہٰذا اگر قرآن کریم سے یہ ثابت ہوجائے کہ شرفِ انسانی کی تکمیل، حال اور مستقبل کی سرفرازی و سربلندی، ہر قسم کی فلاح و بہبود اور نجات و سعادت صرف اس نہج زندگی (دین) سے حاصل ہوسکتی ہے جس کا ترجمان قرآنِ کریم اور اس کے عملی پیکر محمدؐ رسول اللہ ہیں تو دنیا اسے کتنی ہی تنگ نظری پر کیوں نہ محمول کرے آپ کو (دوسروں کے پیمانوں کے مطابق) نگاہ کی ہزار وسعتیں اور قلب کی لاکھ کشادگیاں "اس تنگ نظری" پر قربان کردینی چاہئیں۔ اگر آپ اس کیلئے تیار ہیں تو دامنِ خداوندی کے سایۂ رحمت میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ اور اگر آپ اسے (معاذ اللہ) فی الواقع تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی خیال کرتے ہیں تو اپنی نگاہ کی وسعتوں کے لئے ایسا آسمان تلاش کرلیجئے جہاں چھوٹے کو چھوٹا کہنا تنگ نظری قرار پائے۔ جہاں ناقص کو ناقص کہنا رواداری کے خلاف سمجھا جائے۔ جہاں سچے سے اسلئے اجتناب کیا جائے کہ اس سے جھوٹے کی دلشکنی ہوتی ہے۔ جہاں حقائق کو اس لئے چھپایا جائے کہ ان کے بے نقاب ہوجانے سے مصنوعی نگوں کے چہرے کا رنگ فق ہوجانے کا ڈر ہے اسلام میں تو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ہی پڑے گا ولو کرہ المشرکون۔ جب یہ حقیقت ثابتہ ہے کہ آج اس آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اپنی اصلی اور مکمل شکل میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں تو اس حقیقت کے اعلان سے اس لئے ہچکچاہٹ پیدا ہونا کہ اس سے دوسرے تنگ نظری کا طعنہ دیں گے، اگر خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو راضی رکھنے کا عملی شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْہُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ ۔

اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُہُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُہُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ (۲/۱۵۹)

جو لوگ ان باتوں کو چھپا لیتے ہیں جو ہم نے سچائی کی روشنی اور ہدایت سے نازل کی ہیں، باوجودیکہ ہم نے لوگوں کیلئے انھیں کتاب میں کھول کھول کر بیان کردیا ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنیوالوں کی لعنتیں بھی ان کے حصے میں آتی ہیں۔

جناب آزاد کی محولہ صدر تفسیر تقریباً پونے دوصد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، جس کے آخر میں انھوں نے ان طولانی مباحث کو چند صفحات میں سمٹا دیا ہے۔ یہی وہ خلاصۂ بحث ہے جس سے پنڈت سندر لال جی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ان مقامات کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:-

لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

(الف) اس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہدیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا دین، خدا کی عام بخشش ہے اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(د) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ

جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ھ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لئے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(و) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سر نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انھوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ الدّین اور الاسلام کے نام سے پکارتا ہے۔ (ترجمان القرآن، جلد ۱ صفحہ ۶۳-۶۲)

دوسرے مقام پر شرع و منہاج کے اختلاف کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل حقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ لیکن روح و حقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے۔ یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔ (ص ۱۳۴)

متعدد دیگر مقامات پر بھی انہی خیالات کو دہرایا گیا ہے۔ (بہتر ہو کہ تفسیر مذکور کا آپ خود مطالعہ کریں اور سیاق و سباق کو ملا کر ملاحظہ کریں کہ جناب آزاد کا نظریہ کیا ہے) اس کے بعد یہ دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے نجات و سعادت کے لئے صرف خدا پرستی (اللہ کو مان لینے) اور "نیک عملی" ہی کی ضرورت ہے یا ان کے ساتھ رسالتِ محمدیہ پر بھی ایمان کی ضرورت ہے (جس کے ساتھ ہی قرآن کریم پر ایمان بھی لازم آجاتا ہے۔ اور رسالت نبی اکرمؐ اور قرآن پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ شریعت قرآنی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ اسی کا نام "نیک عملی" ہے) یعنی ساری بحث کا نقطۂ اسکہ یہ ہے کہ ایمان بالرسالت یعنی قرآنی شریعت کی اتباع بھی ضروری ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں کفار و مشرکین کے علاوہ اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ پر ایمان رکھنے کے علاوہ نبی اکرم سے پیشتر کسی نہ کسی رسول اور قرآن سے پہلے کسی نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا اگر بحث کو اور مختصر کر دیا جائے تو وہ اس نقطہ میں سمٹ کر آجائے گی کہ کیا قرآن کریم کی رو سے اہل کتاب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ رسالتِ محمدیہ اور اتباع قرآن پر بھی ایمان لائیں۔ یا اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر پختگی سے عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر قرآن کریم اہل کتاب سے بھی رسالتِ محمدیہ اور

اتباع قرآن کا مطالبہ کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات وسعادت کی کوئی راہ اور نہیں تو بات صاف ہو جائے گی۔ اسلئے کہ جب اہل کتاب سے بھی ان چیزوں کا مطالبہ ہو تو غیر اہل کتاب سے یہ مطالبہ اور بھی شدید ہو جائے گا۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ قرآن کریم جس چیز کو دین یا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآنی تعلیم کا اس باب میں مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رشد وہدایت کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام وملل میں، حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے پیغامات آتے رہے۔ ان پیغامات کی اصل وبنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کی عبودیت۔ اس کے سوا کسی اور کو اس قابل نہ سمجھنا کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کیلئے عملی نظام کی تشکیل میں مقتضیات زمانہ کے اعتبار سے اختلاف ہوتا رہا۔ یہ پیغامات آتے۔ کچھ عرصہ تک اپنی شکل میں قائم رہتے۔ اس کے بعد یا تو آفات ارضی وسماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے یا خود انسانوں کی دستبرد سے ان میں تحریف والحاق ہو جاتا۔ کہیں یہ فراموش ہی کر دیئے جاتے۔ لہٰذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی۔ انہی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر نزول ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی۔ یعنی انسانیت خود اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ اس کے مقتضیات اور ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا اس لئے ہر زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نظام خداوندی کی تشکیل کے عناصر میں بھی ارتقائی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یعنی ہر رسول کے وقت کچھ تو گذشتہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغامات (سچائیوں) کی تجدید ہو جاتی تھی اور کچھ ان پر اضافہ بھی ہو جاتا تھا اور ترمیم وتنسیخ بھی۔ لیکن یہ ترمیم وتنسیخ ہمیشہ ارتقاء وعروج کی طرف لے جاتی تھی۔ تنزل وہبوط کی طرف نہیں جاتی تھی۔ ذیل کی آیت مقدسہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (۲/۱۰۶)

(ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔

یعنی منسوخ شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس سے بہتر اور فراموش شدہ حکم (آیت) کی جگہ اُس جیسا حکم آجاتا تھا۔ چنانچہ قرآن میں کتب سابقہ میں الحاق وتحریف کی تصریحات متعدد مقامات پر مذکور ہیں۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلافات ڈالے گئے) يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (وہ کلمات کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ اُنھیں یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انھوں نے بھلا ہی دیا) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (افسوس ہے ان پر جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے)۔

اس قسم کے متعدد مقامات میں تحریف۔ الحاق۔ فراموشی۔ دانستہ تغیر وتبدل کی تصریحات موجود ہیں۔ اور پھر اس حقیقت باہرہ پر خود ایک دنیا شاہد ہے۔ آج دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعوے کو مبلائل ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو وہ صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں

وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس امر کے لئے بے شمار تاریخی شہادات موجود ہیں کہ ان کتابوں کے اصل نسخوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہرحال یہ سلسلۂ رشد و ہدایت یونہی جاری رہا۔ تاآنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر سِنِ رشد و بلوغ کو پہنچ گئی۔ اب مشیتِ ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آ گیا کہ ان تمام حقائق کو جو اس سے پیشتر حضراتِ انبیاء کرامؑ کی وساطت سے دنیا میں بھیجے گئے تھے اور جو یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے یا ان میں تحریف و الحاق ہو چکا تھا، ان کی اصلی شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے پھر ان تمام احکامات کی جگہ جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات بدل دیئے جائیں جو قیامت تک کے لئے انسانی ضروریات کے لئے مکتفی ہوں۔ اس طرح ان تمام حقائق و اصولات کو یکجا اکٹھا کر کے اسے محفوظ طریقے پر دنیا کو دیا گیا اور اسے قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنے کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔ اس مجموعۂ حقائق، ضابطۂ خداوندی کی اس (LATEST) اور آخری ایڈیشن کا نام قرآنِ کریم ہے۔ اب ساری دنیا میں اعلان کر دیا گیا کہ ہماری نعمتیں مکمل ہو گئیں۔ ضابطۂ حیاتِ انسانی کو آخری ترتیب دے دی گئی۔ تمام سابقہ سچائیاں اس کے اندر آ گئیں۔ اب نجات و سعادت کے لئے صرف یہی ضابطہ قولِ فیصل ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ جہاں ہے ساقط العمل ہے۔ اب دین ہے تو یہی۔ اسلام ہے تو اسی کا نام۔ ایمان ہے تو اس پر۔ اس کے باہر نہ کہیں دین ہے نہ اسلام ہے نہ شریعت ہے نہ منہاج۔ یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے ان پیغامات کو بھیجا جو اس سے پہلے نافذ العمل تھے۔ اسی نے ایک کی جگہ دوسرے کو بھیجا۔ اسی نے ان تمام کو سمٹا کر اس ایک میں جمع کر دیا۔ اور ان تمام کی جگہ اب صرف اسی ایک کو اپنا ضابطۂ قوانین قرار دیا۔ اسی نے اس بات کا حکم دیا کہ اس حقیقت پر ایمان لاؤ کہ اس سے پیشتر جتنے انبیاء کرام تشریف لائے وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔ جو پیغامات انہوں نے دیئے وہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے۔ نہ نبی ہونے کی حیثیت سے ان حضراتِ انبیاء کرام میں کوئی فرق ہے نہ پیغاماتِ خداوندی ہونے کی جہت سے ان پیغامات میں کوئی اختلاف۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اسی خدا نے فرمایا کہ اب اتباع و اطاعت صرف اس مجموعۂ قوانین کی ہوگی جس کا نام قرآنِ کریم ہے۔ یہ ہے الدّین اور یہ ہے الاسلام۔ اسی کا ہر انسان سے مطالبہ ہے اور اسی سے نجات و سعادت وابستہ۔ یہ کہنا درست ہے کہ سچائیاں اپنے اپنے وقت میں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود تھیں۔ لیکن یہ کہنا سراسر خلافِ حقیقت اور خلافِ قرآن ہے کہ "اصل دین ہر مذہب میں یکساں موجود ہے" (ترجمان القرآن جلد ۱ ص۱۳۷)

• موجود تھیں" اور "موجود ہے" میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اور یہی فرق ہے جس پر اس جدید نظریہ کے حق و باطل ہونے کا انحصار ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔ قرآن کا بنیادی مطالبہ ایمان کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایمان سے مراد صرف ایمان باللہ (خدا پرستی) ہی ہے یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔ سارا قرآن ایمان ہی کی تفسیر ہے جس کے اس نے پانچ اجزاء بتلائے ہیں:-

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ (۲/۱۷۷)

بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ، آخرت کے دن، ملائکہ، کتب، اور انبیاء پر ایمان لائے۔

انہی اجزائے ایمانیہ کا انکار کفر اور صریح گمراہی ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (۴/۱۳۶)

اور اللہ، اس کے ملائکہ، اس کی کتب و رسل اور یوم آخر سے انکار کرے تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

لیکن قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر تو ان اجزاء کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور دیگر مقامات پر اس تفصیل کی بجائے اجزائے ایمانیہ کا اجمالی تذکرہ کر دیتا ہے اور سیاق و سباق اور نفس موضوع کے اعتبار سے جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے صرف اسی کو بیان کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۴۱/۳۰)

یقیناً جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔

متعدد مقامات پر صرف اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہی کا ذکر ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۲/۶۲)

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آیا اور اس نے عمل صالح کئے تو ان کا اجر ان کے اللہ کے ہاں ملے گا۔

کہیں خدا اور رسولوں پر ایمان کا ذکر ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (۶۴/۸) (پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ) کہیں ان کے ساتھ ایمان بالکتاب کا بھی ذکر ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا۔)

غرضکہ مختلف مقامات پر مختلف اجزائے ایمان کا ذکر آتا ہے لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ ایمان کے اجزا ایک دوسرے سے الگ کئے جا سکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزاء پر ایمان لے آنا مومن ہونے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مطالبہ تمام اجزائے ایمانیہ کا مشترک ہے ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ شق اول ہے۔

اب شق دوم کی طرف آیئے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ، رسل، کتب پر ایمان لانے سے مفہوم کیا ہے؟ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان سے مقصود اطاعت ہے۔ اللہ پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے کہ اس کے احکامات کی اتباع کی جائے (اطیعوا اللہ) محض اللہ کی ہستی کا اقرار کر لینا ایمان نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں چند دہریوں کے سوا کون ہے جو اللہ کی ہستی کا قائل نہیں۔ نام میں اختلاف ہوگا، تصور میں اختلاف ہوگا، تعینِ صفات میں اختلاف ہوگا۔ لیکن اس کی ذات کا اقرار تو ہر جگہ ملے گا۔ سو اگر ایمان سے مراد فقط اللہ کی ذات کا اقرار ہوتا تو قرآن کریم ان لوگوں کو کافر کیوں کہتا جو خدا کی ہستی کا اقرار کرتے تھے۔ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے کہ جب ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ بارش کون برساتا ہے؟ ہوائیں کون چلاتا ہے؟ تو یہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ! لیکن اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ حیرت ہے کہ اس اقرار کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔ ذات باری تعالیٰ کا ان تمام تفصیلات کے ساتھ اقرار جو قرآن میں مذکور ہیں اور اس کے ساتھ اس کے احکامات کی اطاعت۔ یہ ہے ایمان باللہ کا قرآنی مفہوم۔ چونکہ خدا کے احکام حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملتے ہیں اور خدا کی وحی میں محفوظ ہوتے ہیں اس لئے اللہ پر ایمان کے ساتھ، اس کے انبیاء اور کتب پر ایمان کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اس سے بھی یہی مفہوم ہے کہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ خود قرآن کریم کے متعلق فرمایا:۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء کی پیروی مت کرو۔

دین کا مدار ہی اطاعت پر ہے۔ خالص اور بے لوث خدا کی اطاعت۔ قرآن سے پیشتر کی کتابوں کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی وہ کتابیں ضائع ہوگئیں، محرف ہوگئیں یا ساقط العمل قرار پاگئیں۔ لہٰذا ان کی اطاعت بھی ختم ہوگئی۔ اور جب کتاب ہی اپنی اصلی شکل میں نافذ العمل نہ رہی تو اس کے لانے والے رسول کی رسالت کا زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ ان سب کے بعد نبی آخر الزماں تشریف لائے۔ جن پر نازل شدہ کتاب (قرآن کریم) اپنی اصلی شکل میں قیامت تک کے لئے نافذ العمل ہے۔ اس لئے اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان (یعنی اطاعت) قرآنِ کریم کی اتباع میں مضمر ہے۔ اب نبی اکرمؐ سے پیشتر رسولوں اور قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں پر ایمان سے مفہوم یہ رہ گیا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سچے پیغامبر اور ان کے پیغامات خدا کے سچے احکام تھے۔ اب وہ تمام احکام قرآن کریم کے اندر آچکے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ

اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو پہلی کتابوں (کے دعاوی کو) سچا کر کے دکھانے والی اور اُن (سچائیوں) کی محافظ ہے۔

اس لئے ایک نئی کتاب آجانے کے بعد پرانی کتاب کی اطاعت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ضابطۂ قوانین کا ہر نیا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں جدید اضافوں کے علاوہ سابقہ ایڈیشن کی وہ تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں جن کا نافذ العمل رکھنا ضروری ہوتا ہے لہٰذا زندہ قانون اسی آخری ایڈیشن کا سمجھا جاتا ہے۔ بنابریں قرآن کریم کے بعد مختلف اہل مذاہب (یا اہل کتاب) کا اپنے اپنے ہاں کی سچائیوں (یعنی اپنے اپنے مذہب کی کتابوں) پر کاربند ہو کر زندگی بسر کرنا اصولاً غلط ہے۔ اب "سچائیاں" (ان کے ہاں کی اور ان کے علاوہ تمام جن کی نوعِ انسانی کو ضرورت ہے) صرف قرآنِ کریم کے اندر ہیں۔ چونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ہر نئے رسول اور ہر نئی کتاب کے آنے پر اسی رسول اور اسی کتاب کی اتباع ضروری ہو جاتی تھی۔ اسلئے ہر رسول سے یہ کہدیا جاتا تھا کہ اپنی امت سے کہدیں کہ جب رشد و ہدایت آسمانی کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی آجائے، جس کے بعد کوئی اور رسول اور کوئی اور کتاب نہ آئے گی تو تم سب کو اس آخری کڑی کی اتباع کرنی ہوگی۔ سورۂ اعراف کے انیسویں رکوع میں دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ دعا مانگتے ہیں کہ بارالٰہا! تو نے اس قوم (بنی اسرائیل) پر اپنی نوازشات کو یوں عام کیا ہے تو اس سلسلہ کو اسی طرح جاری رکھیو۔ ارشاد ہوا کہ بیشک ہماری رحمتیں بے پایاں اور ہر شے پر چھائی ہوئی ہیں لیکن ہمارے نظامِ رشد و ہدایت کے مطابق یہ صرف ان کے حصہ میں آسکیں گی جو ہمارے آخری نبی اور آخری کتاب پر ایمان لائیں گے۔ یعنی ان کی اتباع کریں گے۔

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۷/۱۵۶-۵۷)

وہ رحمت میں اُن لوگوں کے لئے لکھدوں گا جو خدا کی حفاظت میں رہیں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات (احکام) پر ایمان لائیں گے یعنی وہ لوگ جو اس نبی اُمّی کا اتباع کریں گے جسے وہ توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔ وہ انھیں نیک باتوں کا حکم دیگا۔ بری باتوں سے منع کرے گا۔ پاکیزہ چیزیں ان کیلئے حلال کرے گا، ناپاک چیزیں حرام کرے گا اور وہ طوق و سلاسل جو ان پر پڑے ہوئے ہوں گے اُن کو ان سے الگ کرے گا۔ جو لوگ اس نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کی عزت کرینگے اور اسکی مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔

غور کیجئے کہ فلاح و سعادت کے لئے قرآن کریم نے کیا شرط لازم قرار دی ہے۔ نبی اکرم پر ایمان اور قرآن کریم کی اتباع۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یہاں صرف حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔ دوسرے مقام پر تمام انبیاء کرامؑ کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۳/۸۱-۸۴)

جب اللہ نے انبیاءؑ سے عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے۔ پھر جب تمہارے پاس وہ رسول آئے جو مُصدّق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا۔ اور اس کی تائید کرنا۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ انھوں نے کہا کہ بیشک ہم اقرار کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے کہا کہ اس پر گواہ رہنا اور دیکھو! تمہارے ساتھ میں بھی اس پر گواہ ہوں۔ تو اب جو کوئی اس عہد و قرار کے بعد اس سے روگردانی کرے گا تو یقیناً ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً و کرہاً سب اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اور بالآخر سب اُسی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اے رسول تم کہدو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب اور یعقوبؑ کی اولاد پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔

تو دیکھو جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کی طلب کرے گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں اُس کی جگہ اُن لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔

انبیاء سے عہد لینے سے مطلب یہ ہے کہ ان کی وساطت سے ان کی امتوں سے عہد لیا گیا تھا۔ چنانچہ کتب سماوی کے جو بچے کھچے حصے کہیں آج بھی موجود ہیں ان میں اس امر کی طرف اشارات ملتے ہیں کہ وہ انبیاء، رشد و ہدایت کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی (یعنی نبی آخر الزماںؐ) پر ایمان لانے کی تلقین کیا کرتے تھے کہ یہی اس نظام خداوندی کا تقاضا تھا۔ لہٰذا نبی اکرمؐ کے تشریف لے آنے کے بعد حضورؐ پر ایمان کے بغیر نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم تفریق بین الرسل (رسولوں میں ایک دوسرے میں فرق کرنے) کو پکا کفر قرار دیتا ہے۔ (۴/۱۵۰)

شق دوم سے ظاہر ہے کہ

(۱) رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے مفہوم صرف انھیں مان لینا نہیں بلکہ ان کی اطاعت کرنا ہے۔

(۲) تفریق بین الرسل کفر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے پیغام رشد و ہدایت لاتے رہے اور اپنے اپنے وقت میں ان کی اطاعت فرض تھی۔

(۳) نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کے بھی یہی معنی ہیں کہ قرآن کی اطاعت کی جائے۔ اور چونکہ حضورؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اس لئے قرآن کی اطاعت قیامت تک کیلئے ہے اور تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔

(۴) اب جو کوئی خدا، اس کے رسولوں اور کتابوں پر اس طرح ایمان لائے گا جس طرح نبی اکرمؐ نے بتایا تو وہی ہدایت پر سمجھا جائے گا۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (۲/۱۳۷)

پس اگر یہ لوگ اس پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ راہِ ہدایت پر ہوں گے اور اگر یہ اس سے پھر جائیں گے تو پھر یہ مخالفت کی راہ ہوگی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جو لوگ تمام مذاہب کو یکساں قرار دیتے ہیں وہ محمدؐ رسول اللہ کی سچائی کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ اس لئے یہ تفریق بین الرسل نہیں۔ یعنی وہ حضورؐ کو بھی خدا کا سچا رسول مانتے ہیں۔ چنانچہ خود جناب آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے خدا کی توحید کے ساتھ حضورؐ کے درجۂ رسالت و عبودیت کا اقرار بھی ضروری ہے۔ ص ۱۱۹ یعنی جناب آزاد کے نزدیک

(۱) دوسرے انبیاء کرام کی طرح نبی اکرمؐ پر ایمان تو ضروری ہے

لیکن

(۲) نجات و سعادت کے لئے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہونا ہی کافی ہے۔

یعنی ان کے نزدیک صورتِ حال یوں ہوئی کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ تھے لیکن اتباع صرف اس کتاب کی کرتے ہیں جو محمد رسول اللہ کو ملی تھی۔ اسی طرح اگر عیسائی اور موسائی حضرت محمدؐ رسول اللہ کو منجانب اللہ سمجھ لیں لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کی کرتے رہیں تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک محمد رسول اللہ پر ایمان سے مفہوم فقط اتنا ہے کہ آپ کے متعلق یہ اقرار کر لیا جائے کہ آپ منجانب اللہ رسول تھے اور بس۔ حالانکہ شقِ دوم میں قرآن کریم کی نصوص صریحہ سے واضح کیا جا چکا ہے کہ جب انبیائے سابقہ (علیہم السلام) اور نبی اکرمؐ (یا کتب سابقہ اور قرآن کریم) کے متعلق ایمان کا لفظ بولا جائے گا تو اس کے قرآنی مفہوم میں ایک بنیادی فرق ہوگا۔ یعنی ایک نئے نبی کے آنے کے بعد سابقہ نبی یا نئی کتاب کے نازل ہونے کے بعد پہلی کتاب پر ایمان کے معنی فقط اتنے ہوں گے کہ وہ نبی یا وہ کتاب اپنے وقت میں منجانب اللہ تھی اور اس نئے نبی اور نئی کتاب کے متعلق ایمان سے مفہوم یہ ہوگا کہ انھیں منجانب اللہ مانا جائے اور ان کی اطاعت بھی کی جائے جس طرح ایک جدید وائسرائے کے آنے کے بعد اس کے پیشرو کے متعلق فقط اتنا ماننا ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں بادشاہ کا جانشین تھا۔ لیکن اطاعت اس جدید وائسرائے کے ذریعے دیئے ہوئے احکام ہی کی لازم ہوگی۔ لہٰذا جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ تمام حضرات اپنے اپنے وقت میں اللہ کے پیغامات کے حامل اور باذن اللہ مطاع تھے۔ لیکن نبی آخر الزمانؐ کی تشریف آوری کے بعد اطاعت فقط قرآن کریم کی باقی رہ گئی۔ اس لئے کہ اس کے اندر تمام سابقہ کتب کی سچائیاں جمع کر دی گئی ہیں اور اس پر جدید احکامات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ لہٰذا تفریق بین الرسل سے صرف اتنا ہی مفہوم نہیں کہ اس امر کا زبانی اقرار کر لیا جائے کہ تمام انبیائے سابقہ (مع نبی اکرمؐ) منجانب اللہ رسول تھے بلکہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے سابقہ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اطاعت خدا کی آخری کتاب کی کی جائے۔ اگر نبی اکرمؐ کی رسالت کا زبانی اقرار ہو اور اطاعت اپنے اپنے مذہب کی کی جائے تو یہ قرآنی ایمان نہیں ہے۔ کفر ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (۴/۱۷۰)

اے نوعِ انسانی! یقیناً تمہاری طرف اللہ کا رسول حق کے ساتھ آ گیا ہے۔ سو اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم کفر کرو تو (تمہارے کفر سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا) جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب اللہ کے لئے ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ ایک شخص مانتا ہے کہ نبی اکرمؐ ایک راستباز اور حق گو انسان تھے۔ وہ خدا کی طرف سے سچے رسول تھے

لیکن اطاعت انہی امور کی کرتا ہے جو اس کے اسلاف سے اس کے پاس چلے آتے ہیں۔ اور جن کی نسبت کسی سابقہ رسول کی طرف کی جاتی ہے۔ تو سوچئے کہ اس کے اس زبانی اقرار و ایمان سے مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ مانتا ہے کہ خدا کی طرف سے حضورؐ پر قرآن کریم نازل ہوا۔ اور اس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ ہدایت و سعادت قرآن کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن وہ اتباع و اطاعت کے لئے اور گوشے تلاش کرتا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حضورؐ کو اللہ کا آخری رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب نہیں مانتا۔ اگر مانتا تو اس کی اطاعت کیوں نہ کرتا۔

جو لوگ اس قسم کی "رواداری" اور "وسعت نظر" کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو خود فریبی میں مبتلا ہیں یا فریب دہی میں۔ اور جو مسلمان انہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ از روئے قرآن اس بات کا بھی امکان ہے کہ رسول اللہ کو خدا کا سچا رسول مانتے ہوئے پیروی کسی اور مذہب کی بھی کی جا سکتی ہے۔ تو وہ ان کے اس فریب پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ خود ہندوستان میں برہمو سماجیوں کا فرقہ موجود ہے جن کے عقائد یہ ہیں:-

(۱) خدائے واحد کی اور صرف اسی کی پرستش کی جائے۔ خدا کا کوئی اوتار نہ مانا جائے۔ بت پرستی کی مخالفت کی جائے۔

(۲) صحیفۂ فطرت کو مذہبی اعتقادات کا بنیادی اصول مانا جائے۔

(۳) اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی خاص کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کیا جائے۔

(۴) ہر مذہب کے سچے اصولوں کو اعتقادی اصول مانا جائے۔

(۵) ظواہر و رسوم پر اعتقاد نہ رکھا جائے بلکہ مقصد اصلی قلبی صفائی کو قرار دیا جائے۔

(ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس)

"رواداری" اور "وسعتِ نظر" کے تمام گوشے اس تعلیم کے اندر سمٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کے باوجود برہمو سماجی حضرات ہندو کے ہندو ہیں۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی الہامی کتاب کی "حقانیت اور صداقت" کے اقرار کے معنی فقط اتنے ہیں کہ زبان سے اقرار کر لیا جائے کہ وہ سچی کتاب ہے۔ ان کے اس ایمان میں اطاعت شامل نہیں ہے۔ قرآنی نقطۂ خیال سے یہ حضرات ایک کھلی ہوئی غلطی پر ہیں مگر چونکہ ان کے سامنے قرآن کریم نہیں اسلئے ان کا یہ عقیدہ چنداں درخورِ اعتناء نہیں۔ لیکن جو شخص قرآن کریم کو اپنے سامنے رکھنے کا مدعی ہو اگر وہ بھی اس عقیدہ کا ہمنوا ہو جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائے؟ وہ قرآن جو کھلے کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۷/۱۵۸)

(اے رسول) ان سے کہدو کہ) اے نوعِ انسانی میں تم تمام کی طرف اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے۔ پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبیِ اُمّی پر۔ جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

لہٰذا کوئی شخص رسول اکرمؐ کو خدا کا سچا رسول اور قرآن کریم کو خدا کی سچی کتاب ماننے کے دعوے میں سچا نہیں ہے تاوقتیکہ وہ قرآن

کی اتباع نہ کرے۔ اور یہ خطاب تمام نوعِ انسانی سے ہے۔ کسی خاص فرقہ یا گروہ سے نہیں۔

اب شق سوم کی طرف آئیے۔ یعنی کیا اتباع میں احکام کتاب کی اتباع بھی ضروری ہے یا محض اپنے اپنے انداز پر خدا پرستی اور نیک عملی ہی نجات و سعادت کیلئے کافی ہے۔ اس باب میں جناب آزاد کے نظریہ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(د) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا۔ اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کیلئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ھ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ ۔ ۔ (ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۶۳)

ان اقتباسات کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۷ کا حسب ذیل تشریحی نوٹ بھی قابل ملاحظہ ہے:۔

(۵) دین حق کی اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے۔ بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔
(ص ۲۲۹ تفصیل اصل کتاب میں دیکھئے)

یہی اقتباسات پنڈت سندر لال جی نے اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ چونکہ خدا پرستی اور نیک عملی کی تلقین تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے اور یہی اصل دین ہے۔ اس لئے ایک ہندو جو اپنے طور و طریقہ پر اپنے مذہب کی شریعت کا پابند ہے، اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق ہے جیسے ایک مسلمان، قرآنی شریعت کے اتباع سے نجات کا مستحق۔

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کی رو سے شرع و منہاج کو کتنی اہمیت حاصل ہے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جناب آزاد نے اپنے اس نظریہ کی رو سے اسلام کی جڑ پر ایسی ضربِ کاری لگائی ہے کہ اس نظریہ کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ شجرِ مقدس پورے کا پورا اکھڑ کر باہر آجاتا ہے۔ قرآن کی رو سے نبی اکرمؐ سے پہلے جتنے انبیاء کرامؑ تشریف لائے وہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوئے اور ایک خاص وقت کے لئے ان کا پیغام نافذ العمل رہتا یعنی ان کی رسالت کا دائرہ زمان و مکان کی حدود سے گھرا ہوا تھا۔ اس لئے ان کی وساطت سے جو احکامات نافذ ہوتے وہ اس خاص قوم کے حالات کے پیش نظر دیئے جاتے جن کی طرف وہ مبعوث ہوتے۔ نبی اکرمؐ کی تشریف آوری سے یہ نظام بالکل بدل گیا۔ حضورؐ کی بعثت کسی خاص قوم، ملک، قبیلہ، گروہ، یا کسی خاص وقت کے لئے نہیں بلکہ آپ کا پیغام عالمگیر اور آپ کی مخاطب تمام نوعِ انسانی ہے۔ سارا قرآن اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہے۔ حضورؐ کی رسالت کا دائرہ زمان اور مکان کے حدود سے محصور نہیں۔ بلکہ دنیا کے ہر ملک میں، ہر زمانہ میں، قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے حضورؐ کی رسالت یکساں ہے اس لئے جو تشریعی احکام قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ کسی خاص قوم کے خاص حالات کو سامنے رکھ کر وضع نہیں کئے گئے بلکہ وہ عالمگیر ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ

قرآن کریم کے تشریعی احکام، نبی اکرمؐ کے زمانہ کے اہلِ عرب کے حالات و مقتضیات کے مطابق نافذ ہوئے تھے تو اسلام کی "عالمگیریت" کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اسلام کے احکامات نہ ہر زمانہ میں نافذ العمل ہو سکتے ہیں نہ ہر قوم پر ان کی پابندی لازم قرار دی جا سکتی ہے۔ اسلئے قرآن کریم کے تشریعی احکام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ

ہر عہد اور قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کیلئے اختیار کئے جائیں۔

اسلام کے دعوائے آفاقیت (عالمگیریت) کی کھلی ہوئی تردید ہے۔ اسلام نوعِ انسانی کا دین ہے اور اس کے احکام و اعمال کسی خاص قوم اور خاص عہد کی حالت کو سامنے رکھکر اختیار نہیں کئے گئے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ مذہب کے ظواہر و رسوم کو میکانکی طریق سے ادا کر لینے کا نام اتباعِ احکام نہیں۔ یہ ظواہر و رسوم جسم کی مثل ہیں جس میں روح کا ہونا نہایت ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے احکام حضورؐ کے زمانہ کے اہلِ عرب کے حالاتِ زندگی کے پیشِ نظر اختیار کئے گئے تھے اور آج انھیں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور نجات و سعادت میں انھیں کوئی دخل نہیں۔ کوئی جاہل ہوتا تو اسے ہم سمجھاتے بھی۔ حیران ہیں کہ جناب آزاد جیسے سمجھدار انسان کو ہم کیسے سمجھائیں کہ اسلام ایک نظام کا نام ہے۔ اور نظام کا ہر جزو کُل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ احکامِ قرآنی اس نظامِ اسلامی کے لاینفک اجزاء ہیں اور دنیا کے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے یا اسلام کے دعوے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جائز قرار دے کہ "نجات و سعادت" ان اعمال و احکام کے علاوہ اور طرح سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ "نجات و سعادت" اسلامی نظام کا فطری نتیجہ ہے۔ اس نظام کے جزئیات کو بدل دیجئے یہ نتیجہ خود بخود بدل جائیگا۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی اور دین قابلِ قبول نہیں، تو اس سے مقصود اسلامی نظام ہے نہ کہ "خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم اور غیر متعین الفاظ۔ قرآن کریم کھولئے اور دیکھئے کہ اس میں ان احکام کی "پابندیوں" کو کتنی اہمیت دی گئی ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اہلِ کتاب خدا کو بھی مانتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق نیک اعمال بھی کرتے تھے۔ بایں ہمہ مسلمانوں کو (خاص حالات کے ماتحت) جس طرح کفار اور مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا اسی طرح ان اہلِ کتاب سے بھی قتال کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کے وقت اہلِ کتاب کے خلاف جو فردِ جرم (چارج شیٹ) عائد کی گئی ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے:۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۔ (۹/۲۹)

اہلِ کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور رسول نے حرام بتایا ہے اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں، ان سے یہانتک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دینا قبول کر لیں۔

اس آیۂ جلیلہ سے حسب ذیل امور کی تصریح ہو گئی۔

(۱) اہلِ کتاب ہر چند خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے (اور ہیں) لیکن قرآن کریم ان کے اس ایمان کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا۔ اسلئے کہ جیسا کہ شقِ اول میں بتایا جا چکا ہے قرآن کریم کی رو سے ایمان وہی ایمان ہے جو اس طریق پر لایا جائے جو قرآن نے بتایا ہے۔

لہٰذا

(۲) اہلِ کتاب کا اس طرح پر ایمان نہ لانے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرام و حلال میں ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھتے جو قرآن کریم نے عائد کی ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اسلام صرف "خدا پرستی اور نیک عملی" (بزعمِ خویش) کا نام نہیں بلکہ قرآن کریم کے تشریعی احکام کی پابندی بھی ضروری ہے۔

(۳) تیسرے ٹکڑے میں اس امر کی وضاحت بیان فرمادی کہ ان لوگوں کا اپنے اپنے طریقہ پر خدا پرست بن جانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے دین الحق قبول کرنا نہایت ضروری ہے یعنی اسلام میں داخل ہونا لازمی شرط ہے۔ دین الحق اس مذہب کا نام ہے جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسی دین کیلئے استعمال ہوئے ہیں ملاحظہ ہو ۹/۳۳، ۴۸/۲۸، ۶۱/۹ مندرجہ صدر آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ لیکن چونکہ یہ حقیقت جناب آزاد کے نظریہ کے خلاف جاتی تھی اسلئے انھوں نے اپنے ترجمہ میں ایسا اضافہ فرمایا ہے جس سے اس کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے۔ وہ اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:-

اہل کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر، نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے اور نہ ہی سچے دین پر عمل پیرا ہیں ..... (ترجمان القرآن ص۸۲)

ذرا غور فرمائیے۔ ترجمہ میں چار لفظوں کے اضافہ نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ "یہ لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے"۔ یعنی قرآن کریم میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ لوگ انھیں حرام نہیں سمجھتے لیکن جناب آزاد نے یہ کہہ کر کہ "جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے"۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن صرف یہ چاہتا ہے کہ یہ لوگ اُن چیزوں کو حرام سمجھیں جو "ان کی کتاب میں" حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔ اندازہ فرمائیے قرآن کریم پر یہ کتنا بڑا اضافہ ہے اور اس اضافہ کی کتنی بڑی جرأت! یہ ہے تفسیر کا وہ طریقہ جس سے یہ حضرات اپنے نظریوں کو قرآنی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہیں ڈرتے کہ یہ جرأت کسقدر بیباک ہے!

گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم کی رو سے اجزائے ایمانیہ پانچ ہیں۔ قرآن میں کسی جگہ خواہ ان میں سے ایک کا ذکر ہو یا ایک سے زیادہ کا۔ مقصود اس سے پانچوں اجزا ہیں۔ ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) ان پانچ اجزائے ایمانیہ میں نبی اکرمؐ کی رسالت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان بھی جزو لاینفک ہے۔

(۳) ایمان سے مفہوم صرف اقرار کر لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اطاعت بھی ہے۔

(۴) ہر رسول اور ہر کتاب کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی اور نبی اکرمؐ کے بعد اطاعت خدا کی آخری کتاب قرآن کریم کی ہوگی نہ کہ پہلی کتابوں کی۔

(۵) قرآن کے تشریعی احکام نظامِ اسلامی کا ضروری جزو ہیں اور ان کی اطاعت لازمی ہے۔

ان تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد اب اس آیت کا مطلب سمجھئے جو اس باب میں اس جدید نظریئے (یکسانیتِ مذاہب) کے مؤیدین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

تحقیق، جو لوگ ایمان والے ہیں اور یہود اور نصاریٰ اور صابئین اور جو شخص بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور عمل اچھے کرے اُن کا اجر اُن کے اللہ کے پاس ہے اور ان کو کسی قسم کا خوف و حُزن نہیں۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور صابئین سے صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا مطالبہ ہے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں۔ جو کچھ ہم اس وقت تک لکھ چکے ہیں اس کے پیش نظر اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔ پہلی چیز تو یہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت صرف انہی دو اجزاء پر ایمان مقصود نہیں بلکہ ان کے اندر پانچوں اجزائے ایمانیہ شامل ہیں۔ قرآن شریف میں جہاں بھی ایمان کا تقاضا ہے مکمل ایمان کا ہے اور اس مکمل ایمان کے متعلق تصریحاً ارشاد موجود ہے کہ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا (اگر یہ لوگ ایسا ایمان لائیں جیسا تم لائے ہو پھر یہ ہدایت پر سمجھے جائیں گے۔)

دوسرے یہ کہ اگر اس سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان ہی کا مطالبہ ہو تو آیت میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ خود مسلمانوں کا بھی ذکر ہے تو کیا مسلمانوں سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ فقط اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں! اگر ان سے بھی یہی مطالبہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن پر ایمان کا مطالبہ کن سے ہوگا!

آیت کا مطلب واضح ہے۔ اسلام سے پہلے لوگوں نے مذہب کو نسلوں (قوموں) کے اندر مقید کر رکھا تھا۔ توریت، قوم بنی اسرائیل (یہود) کے لئے۔ مذہب عیسوی بھی انہی کیلئے، کیونکہ انجیل میں یہ قول حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ "میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں۔ بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالی جا سکتی"۔ ہندوؤں کے ہاں انسانوں کی تقسیم ہی پیدائشی ورنوں کی رو سے ہوتی ہے اور ورنوں کی یہ کیفیت کہ نچلے ورن کا ہندو نہ اوپر کے ورن میں جا سکتا ہے اور نہ ہی خدا کے حریم قدس میں اس کے لئے باریابی کی کوئی راہ کھلی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی مذہبی عقائد میں داخل ہو چکا تھا کہ ایک شخص محض یہودیوں کے ہاں پیدا ہو جانے سے ابناء اللہ (خدا کی اولاد) میں داخل ہو کر نجات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عیسائی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کی نجات کے ذمہ دار حضرت مسیح علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ ایک پیدائش کی رو سے برہمن ہے۔ یعنی مذاہب عالم میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ

(۱) نجات و سعادت محض ایک خاص فرقہ کے گھر میں پیدا ہو جانے سے مل جاتی ہے۔ اور

(۲) اس فرقہ کے باہر کا انسان چونکہ اس فرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا (کیونکہ فرقہ میں داخلہ تو صرف پیدائش کی رو سے ہوتا ہے) اسلئے اس پر نجات کے سب دروازے بند ہیں (واضح رہے کہ ہندوؤں اور یہودیوں میں تبلیغ کا تصور ہی نہیں اور عیسائیوں کے ہاں بھی تبلیغ بعد کی چیز ہے)۔

قرآن نے آکر ان نظریات کی تردید کی اور اعلان کر دیا کہ نجات کو پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی کسی کے گھر میں پیدا ہو (یہودی، نصرانی، صابی وغیرہ) وہ ایمان لانے سے اسلام کے دائرہ میں کھلے بندوں داخل ہو سکتا ہے اور اعمال صالحہ کرنے سے جنت کا اہل بن جاتا ہے۔

(مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝)

باقی رہے مسلمان، سو انھیں بھی اس زعمِ باطل میں نہیں رہنا چاہیئے کہ وہ محض اس لئے کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں، نجات کے حقدار بن جائیں گے۔ انھیں بھی اپنے آپ کو صاحبِ ایمان ثابت کر کے اعمالِ صالحہ کے ذریعہ جنت کا مستحق بنانا ہوگا۔ خود مسلمانوں سے ایمان کا مطالبہ صرف اسی ایک مقام پر نہیں بلکہ اور آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۔ (۴/۱۳۶)

اے مسلمانوں (ایمان والو) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس کے رسول پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو اس سے پیشتر نازل کی گئیں۔

سورۂ توبہ میں ایمان کی اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ایمان محض زبان تک محدود تھا۔ نہ دل کی گہرائیوں میں اس کا سرچشمہ تھا اور نہ اعمالِ حیات اس کے مصدق (انھیں منافقین کہا گیا ہے) زندگی کے باقی شعبوں میں تو خیر پھر بھی یہ نقاب پوشانہ روش کسی نہ کسی طرح نبھ جاتی تھی۔ لیکن میدانِ جہاد ایمان کی بہت بڑی کسوٹی تھی۔ اس موقع پر یہ لوگ اِدھر اُدھر کی بہانہ تراشیوں سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اصطلاحاً "مسلمان" تھے۔ ایمان کا اقرار زبانی ہی زبانی تھا۔ ان کے مقابل میں وہ سچے مسلمان تھے جو مشکل سے مشکل مقام پر اپنے ایمان کا زندہ ثبوت پیش کرتے تھے۔ ان ہر دو فریق کے متعلق فرمایا:۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝ (۹/۴۴-۴۵)

جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں تم سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے۔ (جہاد میں نہ جانے کے لئے) صرف وہی لوگ تم سے اجازت مانگیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک میں حیران و متردد ہیں۔

اس آیۂ مقدسہ سے دو تین باتیں واضح طور پر سامنے آ گئیں۔

(۱) ظاہر ہے کہ وہ اہلِ ایمان (سچے مسلمان) جو جہاد میں مال و جان سے شریک ہوتے تھے، اللہ اور آخرت کے علاوہ ملائکہ، کتب اور رسل پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ لیکن یہاں صرف ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی کا ذکر کافی سمجھا گیا ہے۔

(۲) منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تمام اجزائے ایمانیہ کا اقرار کرتے تھے، مسلمان کہلاتے تھے۔ انہی میں رہتے تھے لیکن قرآن اُن کے ایمان کو ایمان نہیں تسلیم کرتا اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو "اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے"۔

(۳) لہٰذا جب مسلمانوں سے کہا جائے گا کہ "اللہ اور آخرت پر ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو" تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا پیدائشی مسلمان ہونا یا محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینا کافی نہیں۔ ایمان دل سے ہونا چاہیئے اور اعمالِ زندگی سے اس کی تصدیق ہونی چاہیئے۔ یہ ہیں سچے مومن۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝ (۴۹/۱۵)

مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر (اس ایمان میں) انھیں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے اور
اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جان سے جہاد کریں۔ یہ لوگ ہیں سچے (مسلمان)

ان تصریحات کی روشنی میں اب ذرا فریقِ مقابل کے نظریہ کا تجزیہ کیجئے یعنی ایک مسلمان کے لئے "نجات و سعادت" حاصل کرنے کے لئے ایسی کڑی شرطیں ہیں کہ وہ اس انداز کا ایمان لائے جیسا قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ پھر زندگی کے ہر ہر قدم پر اسی بارگاہ سے فیصلہ طلب کرے اور ان فیصلوں کو بطیبِ خاطر منظور کرتا جائے۔ حرام اور حلال کی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرے اور ان سب کے بعد مال اور جان جیسی عزیز ترین متاع کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے۔ اللہ کی راہ میں قربان کرنے پر آمادہ ہو۔ یعنی اپنے آپ کو ہر وقت شہادت گاہ میں تصور کرے تب جا کر کہیں "نجات و سعادت" کا متوقع ہو۔ اس کے برعکس ایک غیر مسلم (مثلاً ہندو) کے لئے فقط اتنا ضروری ہے کہ صبح اٹھ کر اپنے ہاں کے مروجہ طریقہ کے مطابق "خدا کی بھگتی" کرلے اور کبھی کبھار کچھ "دان" (خیرات) کردے۔ مثلاً چڑیوں کو دانہ ڈال دیا۔ سانڈ کیلئے چارہ خرید دیا۔ کیڑوں مکوڑوں کے استھانوں پر آٹا ڈال دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو کہیں پیاؤ بنوا دیا۔ اور استطاعت ہوئی تو کنواں کھدوا دیا۔ سرائے یا ہسپتال بنوا دیا۔ "دان" (خیرات) کی کچھ ایسی ہی مدات ہیں۔ اس کے بعد اپنے اوپر نہ کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت۔ نہ اسلامی احکام کی کٹھن منازل طے کرنے کی حاجت۔ نہ ہجرت کی صعوبات اٹھانا ضروری، نہ خدا کی راہ میں سر کٹوا دینے کا سوال درپیش۔ (وہاں تو بلکہ جہاد کا تصور ہی گناہ ہے کہ یہ ہمسا میں داخل ہے) ہی نہیں۔ بلکہ جہاں ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف اس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے جو خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ اس غیر مسلم کو کھلی اجازت ہے کہ وہ جونسا نظام اپنے لئے چاہے وضع کرلے اور جس نظام کے ماتحت چاہے زندگی بسر کرے۔ وہاں نظام، انسانی اور خدائی نظام، یا عدم نظام کا سوال ہی کچھ نہیں۔ اسے بس اتنا ہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس سے وہ نجات کا مستحق قرار پا جائے گا۔ اب سوچئے کہ جب انسانی زندگی کی تمام کد و کاوش کا منتہیٰ ٹھہرا حصولِ نجات، اور یہ مقصد ایک طرف اس قدر جاں گسل اور صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہو اور دوسری طرف اتنی آسانی سے۔ تو وہ کونسا "صحیح العقل" انسان ہوگا جو اس قدر آسان طریقہ کو چھوڑ کر ایسا کٹھن طریقِ زندگی اختیار کرے گا جس میں ایک ایک سانس پر قیامت کا سامنا ہو۔ اگر نجات اسی طرح سے حاصل ہو جاتی تھی تو پھر قرآن کریم میں اس قدر تفصیلی ہدایات اور احکامات کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں فقط اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ لوگو! خدا کی ہستی کو مانو اور اپنے اپنے طور طریقہ پر نیکی کے کام کرتے رہو، تمہارے لئے نجات یقینی ہے۔ اگر یہ "رواداری اور وسعتِ نظر" کی ایسی "صلح کل" روش اختیار کر لی جاتی تو نہ کہیں سے مخالفت کی آواز اٹھتی نہ کوئی برسرِ پیکار ہوتا، نہ حضورؐ اور آپ کے متبعینؓ کو اس قدر تکالیف کا سامنا ہوتا، نہ مکہ چھوڑنا پڑتا، نہ مدنی زندگی میں اس قدر غزوات اور سرایا کی ضرورت پڑتی۔ ساری دنیا خوش ہو جاتی اور انسانوں کو نجات کا طریقہ بھی نہایت آسان سا مل جاتا اور پھر اس کے بعد آج تک یہ جو چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی مسلسل ستیزہ کاری چلی آتی ہے اس کا بھی کہیں وجود نہ ہوتا۔ ساری دنیا (سوائے چند دہریوں کے

جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں) "مومن" ہوتی، اور کفر و اسلام حق و باطل کا کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوتا۔

"خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم الفاظ پر ذرا پھر غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ خدا پرستی کسے کہتے ہیں اور نیک عملی کیا ہے؟ کیا یہی کہ جس انداز پر کسی کا جی چاہے خدا کی پوجا (پرستش) کرلے اور جس کام کو وہ نیک سمجھتا ہے اسے اختیار اور جسے بُرا قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کرلے؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ (یا مذہبی اصطلاحات) مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں لیکن وہ اس اسلامی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتے جن کے لئے وہ شروع میں اختیار کئے گئے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ الفاظ اسلامی تعلیم کے صحیح ترجمان نہیں بلکہ بعض اوقات ان سے ایک ایسا مفہوم مترشح ہوتا ہے جو روحِ اسلام کے یکسر منافی ہوتا ہے۔ انہی الفاظ میں "پرستش" کا لفظ بھی داخل ہے۔ دیگر ادیان میں خدا اور بندے کا تعلق پرستش اور پوجا (WORSHIP) کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں اس کیلئے عبودیت کا لفظ ہے جو پرستش سے الگ معنی رکھتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے وہ تمام غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو یکسانیتِ مذاہب تک منجر ہوتی ہیں۔

اپنے سے کسی بڑی ہستی کا تصور انسان کے اندر ابتدا سے چلا آتا ہے۔ جب انسانیت اپنے عہدِ طفولیت میں تھی تو انسانوں کی زندگی انفرادی تھی۔ جنگلوں اور غاروں میں رہائش، پھل اور شکار ذرائع معاش۔ کسی ایک انسان کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں۔ اس زندگی میں "خدا" کے ساتھ اتنا ہی تعلق سمجھا جاتا تھا کہ مصیبت کے وقت اس کے سامنے جھک گئے۔ خوشی کے وقت اس کے حضور ناچنے کودنے سے جشنِ شادمانی منعقد کر دیا۔ خدا، دیوی، دیوتاؤں کے لباس میں تھا یا بتوں کی شکل میں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ ان دیوتاؤں کو خوش رکھے۔ اس کوشش کے مظاہر کا نام پرستش یا پوجا پاٹ تھا۔ اس دوران میں جب کبھی وحیِ آسمانی کی روشنی آگئی اس نے انسانی تصورات کے ان غلط پردوں کو اٹھا کر خدا کا صحیح تصور پیش کر دیا۔ جب وہ روشنی گم ہوگئی تو پھر وہی تاریکی چھا گئی، رفتہ رفتہ انسانیت نے کچھ اور ارتقائی منازل طے کئے اور انسانوں نے مل جل کر رہنے کی طرح ڈالی۔ اب انفرادیت سے قبائلی زندگی کی طرف رجحان ہوا۔ انسانوں کا ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا تعلق قائم ہوا۔ اشتراکِ عمل کی صورتیں جلوہ پیرا ہوئیں۔ اس سے باہمی حقوق اور ان کی نگہداشت کا سوال پیدا ہوا اور ان کے صحیح تعین کے لئے خدا کی طرف سے احکام بھی آنے شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر انسانی مقتضیات ہوتے تھے اسی اندازہ سے احکام ملتے تھے۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا، ان مقتضیات میں ترقی اور تبدیلی ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ساتھ سلسلۂ احکاماتِ الٰہیہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان احکام کی رو سے انسان اور خدا کے درمیان تابع اور متبوع، حاکم اور محکوم کا تعلق قائم ہوا۔ چونکہ آسمانی ہدایت زیادہ عرصہ تک انسانوں کے پاس محفوظ شکل میں نہ رہتی تھی اس لئے احکامات کی روح مسخ ہو جاتی۔ خدا کے متعلق حاکم اور فرمانروا کا تصور بھی گم ہو جاتا اور پھر وہی "پرستش" کا ابتدائی تصور غالب آجاتا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ انسانوں نے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کی زندگی اختیار کر لی اور اس کے بعد اُن کی تمام جدوجہد کا منتہیٰ اجتماعیت کی تشکیل پا گیا۔ اب وقت تھا کہ انہیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیدیا جاتا جس میں نظامِ اجتماعیت کی مکمل ترین صورتوں کے لئے آئین

قوانین موجود ہوں۔ اس ضابطہ نے یہ بتایا کہ نظامِ اجتماعیت کے لئے جسقدر آئین وضوابط ذہنِ انسانی کی پیداوار ہوں گے وہ انسانیت کی نشوونما ارتقاء کے راستہ میں حائل ہوں گے۔ انسانیت کی نشوونما صرف اس ضابطۂ حیات کی رو سے ہوسکتی ہے جو تشکیلِ اجتماعیت کے لئے خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اور جسے قرآن کریم کہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اب خدا پر ایمان رکھنے والے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعتوں کے وضع کردہ نظامہائے زندگی کی جگہ اس نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد کرے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں انسانوں کی جگہ خدا کی بادشاہت قائم ہو۔ اور اس طرح انسان، اللہ کے سوا کسی اور کا عبد نہ بنے۔ یہ ہے خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق یعنی عبد و معبود، محکوم اور حاکم کا تعلق۔ عبودیت سے مراد یہ ہے کہ اپنی تمام قوتوں کو نظامِ خداوندی کے تقاضوں کے مطابق صرف کیا جائے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ پرستش کا لفظ خدا اور بندے کے تعلق کے قرآنی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ صرف ادا ہی نہیں کرتا بلکہ ایک الگ مفہوم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مفہوم جو انسانیت کے عہدِ طفولیت کا پیدا کردہ اور اس کی انفرادی زندگی کے دور کی یادگار ہے۔ اس معنی میں "خدا پرستی" تو ہر مذہب میں ایک جیسی ہوسکتی ہے لیکن خدا کی عبودیت صرف اسلام میں داخل ہو کر ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لئے جس ضابطۂ خداوندی کی رو سے خدا کی محکومیت اختیار کی جاسکتی ہے وہ آج قرآن کریم کے باہر اور کہیں نہیں۔ اسلام کا مطالبہ نظامِ خداوندی قائم کرنے کا ہے "خدا پرستی" (یعنی خدا کی پوجا یا پرستش کرنے) کا نہیں۔ لہٰذا ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کی محکومیت کو جائز نہیں سمجھتا"۔ باقی چاروں اجزائے ایمان اسی اصل کی شاخیں ہیں۔ یعنی

(۱) خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا اقرار — اللہ پر ایمان

(۲) یہ محکومیت اس ضابطہ کی رو سے اختیار کی جائے گی جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، اور جس کی آخری شکل قرآن کریم ہے۔ — کتابوں پر ایمان

(۳ تا ۴) یہ ضوابط ملائکہ کے ذریعہ حضرات انبیائے کرامؑ پر نازل ہوتے رہے اس سلسلہ کی آخری کڑی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ — ملائکہ اور رسولوں پر ایمان

(۵) اس طرزِ زندگی کا فطری نتیجہ دنیا کی سرفرازی اور آخرت کی سربلندی ہے اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ — آخرت پر ایمان

یہ ہے قرآنی ایمان سے مفہوم۔ ان اجزائے ایمانیہ میں سے سب کا ذکر ہو یا کسی ایک جزو کا۔ مقصد پورے کے پورے نظام سے ہے۔

اب رہی "نیک عملی" سو روحِ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد اس کی تعریف بھی کچھ مشکل نہیں رہتی۔ ہر وہ قدم جو دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لئے اٹھے نیک ہے اور جو اس کے خلاف ہو برا ہے۔ انسان اپنے ابتدائی عہد میں جس طرح ایمان باللہ سے مفہوم صرف خدا کی پرستش (پوجا) لیتا تھا اسی طرح اس کا نیکی کا تصور بھی بہت ابتدائی تھا۔ اس زمانے میں زندگی انفرادی تھی اس لئے نیکی اور بدی بھی انفرادی اعمال کا نام تھا۔ مثلاً اگر وہ دیکھتا کہ ان میں کا ایک انسان بیماروں سے ہمدردی کرتا ہے، ضعیفوں کی مدد

کرتا ہے۔ جانوروں پر شفقت کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو وہ ایسے انسان کو نیک آدمی خیال کرتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انفرادی زندگی میں نیکیاں اسی قسم کی ہو سکتی ہیں لیکن اجتماعی زندگی میں نیکی اور بدی کا معیار اس سے کہیں بلند ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب و تمدن کے اساس و مبانی کیا ہیں۔ وہ انسانوں کے لئے کس قسم کا نظامِ زندگی تجویز کرتی ہے۔ دنیا پر اس تہذیب و نظام کے اثرات کیا ہیں۔ اگر اس کے اثرات انسانیت کش ہیں تو اس قوم کے افراد کی ذاتی "نیکیاں" (مثلاً خیرات وغیرہ) انسانیت کی میزان میں نیکیاں نہیں قرار پا سکتیں۔ جب تک وہ لوگ اس نظام کے ممد و معاون اور دست و بازو رہیں گے، ان کا کوئی عمل، عملِ صالح نہیں کہلا سکیگا کسی کی رگِ جان پر جونکیں لگا دینا کہ وہ اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیں اور جب اس پر ضعف کے دورے پڑنے لگیں تو اس کے حلق میں شربت ٹپکانا، سطح بین نگاہوں میں ہی نیکی قرار پا سکتا ہے۔ قرآن کریم نظامِ عدل کے قیام کی تعلیم دیتا ہے جس کا مفہوم تمام نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفظ ہے۔ اس نظام کا نام خدا کی بادشاہت ہے۔ ایک شخص بڑا مخیر ہے۔ اچھے اچھے کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ غریبوں کی امداد کرتا ہے عادات و خصائل نہایت عمدہ ہیں۔ لیکن حکومتِ وقت کو تسلیم نہیں کرتا یا اس کی جگہ کسی دوسری حکومت کے قیام کی فکر میں ہے تو حکومت کی نگاہوں میں یہ جرم ایسا سنگین ہے کہ اس کی "ذاتی نیکیاں" اس کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ اگر اس کے خلاف یہ جرم ثابت ہو جائے تو اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

خدا کی بادشاہت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام ایمان ہے اور اس کے خلاف زندگی کا نام کفر۔ اب آپ خود ہی اندازہ فرمایئے کہ کفر میں زندگی بسر کرنے والے کی ذاتی نیکیاں میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائگاں جاتے ہیں) یعنی جن اعمال کو وہ بزعمِ خویش نیک سمجھتے ہیں وہ درحقیقت نیک ہوتے ہی نہیں، اس لئے ان کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلتا۔ آپ چاک کو کونین سمجھ کر صبح و شام پھانکتے رہئے، ملیریا کبھی دور نہیں ہوگا۔

> وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ . . . . فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ (۲۴ ـ ۳۹ ـ ۴۰)
>
> جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے اعمال ایک صحرا میں سراب کی طرح ہیں جسے ایک پیاسا پانی سمجھتا ہے (اور اس کی طرف جاتا ہے) لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو وہاں کوئی (اصلی) چیز اُسے نظر نہیں آتی۔ (البتہ) وہاں اللہ نظر آتا ہے جو اسے پورا پورا حساب دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بہت سریع الحساب ہے۔ یا (ان کے اعمال) ایک بحرِ ذخار میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح ہیں جہاں موج پر موج متلاطم ہو اور ان کے اوپر (سیاہ) بادل تو بر تو ظلمات (ایسا کہ) جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو سجھائی نہ دے (اور حقیقت یہ ہے کہ) جسے اللہ روشنی نہ دے اُسے کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔

اس لئے کہ یہ لوگ نظامِ حیات کو اعمالِ حیات سے الگ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اعمال وہی نتیجہ خیز ہیں جو صحیح نظام کے تابع ہوں۔ نظام سے الگ ہٹ کر انفرادی اعمال کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ سورۂ توبہ کے تیسرے رکوع کو دیکھئے کیسے دل نشین انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:-

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ . . . . . الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۹/۱۹)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانا (سبیلیں لگوا دینا) یا خانۂ کعبہ کی خدمت (کرنے والا) اس شخص کے برابر ہے جو اللہ اور آخرت (نظامِ خداوندی) پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے راستے میں جدوجہد کرتا ہے (تمہاری سطح میں نگاہیں کچھ ہی کہیں) اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ ظالمین کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ان امور کی تصریحات موجود ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ قرآنی معیار کے مطابق "نیک عملی" کسے کہتے ہیں۔

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ یہ نظریہ کہ نجات و سعادت کے لئے کسی خاص نظامِ زندگی کی ضرورت نہیں "خدا پرستی اور نیک عملی" جو اصولی طور پر ہر مذہب میں یکساں موجود ہے، نجات کے لئے کافی ہے، کس قدر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ یہ دعویٰ کہ اسلام کو باقی ادیان پر افضلیت و فوقیت حاصل ہے کسی مذہب کے خلاف عداوت پیدا کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اسلام محض اختلافِ مذاہب کی بنا پر عداوت نہیں سکھاتا، وہ تو امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ اس کے اس دعوے کا اعلان و تبلیغ نوعِ انسان کی ہمدردی اور بہی خواہی ہے۔ جیسے آپ کسی مریض سے کہیں کہ بھائی تمہارا مرض اِدھر اُدھر کے بیقاعدہ علاج سے نہیں جائے گا۔ اس کیلئے فلاں طبیب کی طرف رجوع کرو۔ وہی ان امراض کا ماہر ہے اور اسی کے ہاں اصلی نسخے مل سکتے ہیں۔ یہ مشورہ مریض سے عداوت نہیں بلکہ محبت پر مبنی ہے۔ عداوت تو اسی کی طرف سے ہو گی جو یہ کہے گا کہ نہیں سب دواخانے ایک ہی جیسے ہیں جہاں سے جی چاہے نسخہ لکھواؤ اور دوائی خرید لو۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب دوائی خانوں کے اصلی مالک نے اعلان کر دیا کہ اب صحیح نسخے صرف فلاں دواخانہ سے مل سکیں گے (باقی دواخانے ہمارے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دھوکا دیتے ہیں) تو ہر دواخانے کو ایک جیسا بتانا مالک کے اس اعلان کی تکذیب اور مریض سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ وَفِيْهَا اٰيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۔

اس مقالہ میں اسلام کے لئے بھی "مذہب" کا لفظ لکھ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلام درحقیقت مذہب نہیں، دین ہے۔ اس لئے اسلام کا مذاہبِ عالم کے ساتھ مقابلہ ہی غلط ہے۔ جب یہ مذہب ہے ہی نہیں تو مذاہب کے ساتھ اس کا مقابلہ کیسا؟ یہ دین ہے اور دین کے معنی ہیں نظامِ حیات۔ اسلئے اسلام کا مقابلہ کرنا ہو تو دنیا کے دیگر نظاہائے حیات کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ ابوالکلام صاحب آزاد اور ان کے اتباع میں اور لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کو بھی مذہب تصور کرتے ہیں۔ جب اسے ایک مذہب تصور کر لیا جائے تو پھر واقعی اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس صورت میں اسلام کی افضلیت ثابت کرنا بے سود کوشش ہے۔ جب مقصد پوجا پاٹ ٹھہرا تو پوجا مندر میں کر لی تو کیا اور مسجد میں کر لی تو کیا۔ جب مقصود یاترا ہو جائے تو ہردوار چلے گئے تو کیا اور رکے ہوئے تو کیا۔ جب مطلب دان (خیرات) سے ہو تو کسی کو بھیک دیدی تو کیا اور زکوٰۃ دیدی تو کیا۔ اس تصور کے ماتحت فی الواقعہ "خدا پرستی اور نیک عملی" سب جگہ ایک جیسی رہ جاتی ہے بلکہ اس کے لئے "خدا پرستی" کی شرط بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ ضوابطِ اخلاق (سچ بولو۔ جھوٹ

نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ حرام نہ کھاؤ۔ زنا نہ کرو) ہر جگہ یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں وہ بھی ان ضوابط کو اچھا کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے "خدا پرستی" بھی کچھ ضروری نہیں رہتی۔ ان ضوابط اخلاق کا نام "سچا دین" قرار پاجاتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں ایک مدت سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے اس لئے ان کے ہاں بھی خدا سے صرف پوجا پاٹ کا تعلق باقی رکھا جاتا ہے اور "نیک عملی" ان ضوابط اخلاق کا نام رکھ لیا جاتا ہے۔ چند عقائد، چند عبادات کی شکلیں اور وہ اخلاقی احکام جو ہر جگہ عام ملتے ہیں۔ بس ان کے مجموعے کا نام ہے اسلام۔ اس اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کچھ فرق نہیں۔ ابوالکلام صاحب کے پیش نظر بھی اسلام کا یہی تصور تھا اس لئے ان کا نتیجۂ مستخرجہ بھی ٹھیک تھا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور باقی مولویوں میں فرق صرف اتنا ہوا کہ انھوں نے اس بات کا اعلان کر دیا اور دوسروں نے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پائی۔ ورنہ عملاً ہر مولوی کا یہی عقیدہ ہے خواہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے۔ یا یوں کہئے کہ ان کے عقیدے کا لازمی نتیجہ وہی ہے جس کا اعلان آزاد صاحب نے کر دیا ہے۔

لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مذہب نہیں، ایک نظام حیات ہے تو پھر اس بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اس اسلام سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کا تصور آزاد صاحب پیش کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر نظام حیات ایک خاص ذہنیت کا مقتضی ہوتا ہے جب تک وہ ذہن پیدا نہ ہو اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ ایمان اس خاص ذہنیت کو کہتے ہیں جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ قرآن کی رو سے تمام نوع انسانی کے لئے ایک ہی نظام حیات ہے۔ لہٰذا تمام نوع انسانی کے لئے ایک ہی انداز ایمان ہے۔ اسلام کے اس قرآنی تصور کی رو سے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ نظام ہر قوم اور مذہب میں ایک جیسا ہے۔ یہ نظام قرآن کے علاوہ کہیں اور ہے ہی نہیں۔ اس لئے تقابل کا سوال ہی سامنے نہیں آتا۔

یہ ہے وہ بنیادی غلطی جس پر ابوالکلام صاحب آزاد کی برہمو سماجی تفسیر کی پوری عمارت اٹھتی ہے۔

الشرق کراچی پاکستان میں سنجیدہ صحافت کی جسقدر ضرورت ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے جس گوشہ سے بھی کوئی صحیح کوشش ہوتی ہے اسے دیکھکر ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ الشرق اسی قسم کی آرزو کا نتیجہ ہے۔ یہ پندرہ روزہ مجلہ احمد عبداللہ المسدوسی صاحب (حیدرآبادی) کے زیر ادارت شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اتفاق سے پہلے تینوں شمارے خاص نمبروں پر مشتمل ہیں۔ پہلا شمارہ حضور رسالتمآبؐ کی عید میلاد کی یاد میں۔ دوسرا قائداعظم مرحوم کے یوم ولادت کی تقریب پر اور زیر نظر شمارہ دستور پاکستان سے متعلق خصوصی مقالات کا حامل ہے۔ سلجھے ہوئے خیالات متین انداز میں پیش کردہ۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مجلہ ہماری صحافت میں ایک عمدہ طرح ڈال دے گا۔

قیمت فی شمارہ ۴ر۔ ملنے کا پتہ مکتبہ خدام ملت فریر روڈ۔ کراچی۔

حقائق وعبر

احترام سندھ کے ایڈووکیٹ جنرل مسٹر اے۔ کے۔ بروہی کا ایک مقالہ بعنوان احترام (REVERENCE) معاصر ڈان کی اشاعت بابت ۷، و ۸ فروری میں شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے کارلائل اور گوئٹے وغیرہ کی اسناد اور سقراط کی مثال سے بتایا ہے کہ نوجوانوں کا حقیقی جوہر یہ ہے کہ وہ اپنے اندر احترام کا جذبہ پیدا کریں۔ بغاوت اور سرکشی کوئی قابلِ قدر جذبہ نہیں تعلیم و تربیت کا حاصل، تعظیم و تکریم اور احترام و سپردگی کے جذبات ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا ہے کہ ہمارے زمانے میں تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس سے طالب علموں کے دل میں احترام و تعظیم کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ وہ سرکشی اور بغاوت میں فخر محسوس کرتے ہیں اور

> یہ مسلک ہمارے معاشرہ کے لئے بڑا خطرناک ہے اگر اس کی جلدی اصلاح نہ کی گئی تو اس کے نقصانات کی تلافی ناممکن ہو جائے گی۔

ہم مسٹر بروہی سے حرفاً حرفاً متفق ہیں کہ احترام و تعظیم کے جذبات، شرفِ انسانیت کے آئینہ دار ہیں اور جس معاشرہ کے نوجوانوں کے دل ان جذباتِ عالیہ سے عاری ہوں گے وہ معاشرہ کبھی مہذب و متمدن نہیں کہلا سکے گا۔ ہم اس سے بھی متفق ہیں کہ خود معاشرہ کے قیام و بقا کے لئے ضروری ہے کہ افرادِ معاشرہ کے دل میں احترام و تکریم کے جذبات موجزن رہیں۔ بغاوت اور سرکشی کی بنیادوں پر کوئی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آج ہماری قوم کے نوجوانوں کے دل سے احترام و تعظیم کے جذبات اٹھتے چلے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ بغاوت و سرکشی کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں جن کے مظاہرے آئے دن ہمارے اجتماعات میں ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ احترام کس کا کیا جائے؟ تعظیم کا مستحق کون ہے؟ جذباتِ سپردگی کی عقیدت کس کی بارگاہ میں پیش کی جائے؟ کس شخص کو واجب التکریم اور کون سے حکم کو واجب التعمیل سمجھا جائے؟ اس ضمن میں مسٹر بروہی فرماتے ہیں کہ

> ماں باپ کے حکم کا احترام۔ استاد کے حکم کا احترام، معاشرہ کے احکام کا احترام جو اس کی اقدار و روایات و قوانین کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

ہمیں اس سے اختلاف ہے کہ ماں باپ، استاد، اسلاف کا ہر حکم (بلا مشروط) واجب الاحترام ہے، اور معاشرہ کی تمام اقدار، روایات اور ضوابط بلا استثناء واجب التعمیل۔ اگر بروہی صاحب کے نزدیک اسی کا نام جذبات احترام و تکریم ہے تو ان جذبات سے دنیا کی کوئی قوم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس سے انسانیت کا ارتقا رک جاتا ہے اور شرفِ آدمیت پر جمود و خمود طاری ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کے نوجوانوں کو یہ سبق دیا جائے کہ جو کچھ ماں باپ اور اساتذہ کہیں اسے بلا چون و چرا تسلیم کئے جاؤ۔ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اسے کبھی تنقیدی نگاہ سے نہ پرکھو۔ اپنے معاشرہ کی روایات و ضوابط کی شدت سے پابندی کرو اور ان کا کبھی جائزہ نہ لو۔ تو اس

قوم میں کبھی ایسے انسان پیدا نہیں ہوں گے جو اپنی ذہنی بالیدگی سے قوم کی سطح کو بلند کرسکیں اور کاروانِ انسانیت کو ایک قدم بھی آگے لے جاسکیں۔ یہ وہی کورانہ تقلید ہوگی جس کا نتیجہ انسان کو حیوان بنا دینا ہوتا ہے (بلکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق حیوان سے بھی بدتر۔ اولٰئک کالانعام بل ھم اضل)۔ اس میں شبہ نہیں کہ بادی النظر میں اس قسم کی تعلیم بڑی خوش آئند دکھائی دیتی ہے کہ ہر ایک تعظیم کرو۔ جو اپنے سے بڑا ہو اس کا حکم مانو۔ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ استاد کی فرمانبرداری کرو۔ اسلاف کے طریقے سے ایک قدم اِدھر اُدھر نہ ہٹو۔ اپنے معاشرہ کی روایات کا احترام کرو اور اس کے ضوابط کی تعمیل۔ لیکن اگر بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو یہ تمام حسین و جمیل جذبات پیدا کردہ ہیں اُس دورِ استبداد کے جس میں سکھایا یہ جاتا تھا کہ

اگر شہ روز را گوید شب است ایں ۔۔۔ بباید گفت اینک ماہ و پروینؔ[1]

اور پڑھایا یہ جاتا تھا کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطاستؔ[2]

یہی وہ "اخلاقی ضوابط" تھے جن کی رو سے "ہر بڑے" کا حکم واجب التعمیل قرار پاجاتا تھا۔ اس تعلیم کا آغاز "ماں باپ کی اطاعت" سے ہوتا تھا۔ اس سے آگے استاد کی اطاعت تھی، یہ استاد، پاٹھ شالاؤں میں برہمن اور مسجدوں اور مکتبوں میں ملا ہوتے تھے۔ انہی سے پیشوائیت (PRIESTHOOD) کی اطاعت مسلم ہوجاتی تھی۔ اس کے بعد اسلاف کی اطاعت جو مُردوں کی پرستش (ANCESTORAL WORSHIP) پر منتج ہوتی تھی۔ اور اس سیڑھی کے ذریعے آخرالامر بادشاہ کی اطاعت، جو ایشور کا اوتار یا ظل اللہ (خدا کا سایہ) بن جاتا تھا۔ "بزرگوں کی تعظیم" اور "روایات کے احترام" کے یہی وہ جذبات ہیں جنہیں (ROBERT BRIFFAULT) رابرٹ بریفالٹ (CUSTOM THOUGHT) اور (POWER THOUGHT) کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ

> اس سے عقل و شعور کے صرافے میں جعلی سکوں کی بھرمار ہوجاتی ہے اور انسان اُن افکار کی رُو سے سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے جن پر جعلی اقدار کی مہریں ثبت کردی جاتی ہیں۔ اور اس طرح وہ ہر شے کو رنگین چشمے سے دیکھتا ہے۔[3]

جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، یہ "اخلاقی ضوابط" بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں (جس طرح سینٹ پال کی یہ غلامانہ تعلیم کہ "دشمن سے بھی پیار کرو" اور "ایک گال پر طمانچہ کھاکر دوسرا گال سامنے کردو")۔ لیکن قرآن اس قسم کے غلط جذبات کی کوئی رعایت نہیں کرتا۔ وہ حقائق کو بے نقاب پیش کردیتا ہے خواہ انہیں (FACE) کرنا بعض طبائع پر کتنا ہی گراں کیوں نہ گذرتا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ واجب الاحترام صرف وہ حکم ہے جو حق پر مبنی ہے اور واجب التکریم وہ ہستی جو حق کا حکم دیتی ہے۔ جو حق کا حکم نہیں دیتا وہ قطعاً واجب الاحترام نہیں خواہ وہ باپ ہو یا استاد۔ اسلاف ہوں یا اخلاف۔ معاشرہ ہو یا حاکم۔ روایات ہوں یا "مسلمات"۔ نہ صرف یہ کہ ایسا فیصلہ

---

[1] اگر بادشاہ دن کو رات کہدے تو اس کے جواب میں کہنا چاہئے کہ ہاں حضور! وہ دیکھئے آسمان پر چاند اور ستارے چمک رہے ہیں۔

[2] بزرگوں کی غلطی پکڑنی بہت بڑا جرم ہے۔

[3] THE MAKING OF HUMANITY ; P. 83

واجب الاحترام نہیں بلکہ اس کی مخالفت فرض ہے۔ قرآن کریم نے قصۂ حضرت ابراہیمؑ میں اس حقیقت کے مختلف گوشوں کو نہایت واضح انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے باپ کو دیکھتے ہیں کہ وہ بتوں کے سامنے جھکتا ہے۔ بیٹے کی نگہ حقیقت شناس، باپ کی اس روش میں کھلی ہوئی گمراہی دیکھتی ہے۔ وہ باپ سے برملا کہتے ہیں کہ

یا ابت لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئا۔ (۱۹/۴۱)

اے میرے باپ! تو ان پتھروں کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی تیرے کسی کام آسکتے ہیں۔

ایسا کہنے میں نہ تو باپ کا احترام ان کے عناں گیر ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے معبودوں کی تعظیم دامن کش۔ وہ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو قوم کے بڑے بوڑھوں سے خطاب کرتے ہیں کہ

ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون۔ (۲۱/۵۱)

یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پرستش پر تم اس طرح جم کر بیٹھ رہے ہو؟

"بزرگوں کا احترام" یہاں بھی (حضرت) ابراہیمؑ کے گلوگیر نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں قوم اسلاف کی تعظیم کے جذبے کو ابھارتی ہے اور ابراہیمؑ سے کہتی ہے کہ

قالوا وجدنا اٰباءنا لھا عبدین۔ (۲۱/۵۳)

ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔

انہی کی اتباع میں ہم ایسا کرتے ہیں۔ اسلاف کا احترام، بزرگوں کی عظمت، معاشرہ کی روایات کا یہی تقاضا ہے کہ ہم وہی کچھ کریں جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس کے خلاف دل میں خیال تک لانا بھی جرم ہے۔ غور کیجئے! قوم کے بڑے بوڑھوں نے کس طرح اسلاف کی عظمت اور روایات کے احترام کو بطور دلیل پیش کیا ہے؟ لیکن حضرت ابراہیمؑ پر اس کا کیا اثر ہوا؟ کیا وہ "بڑوں کے احترام" اور معاشرہ کی روایات کی تعظیم سے مرعوب ہوگئے؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے پوری جرأت اور بے باکی سے کہا کہ

لقد کنتم انتم واٰباؤکم فی ضلٰل مبین۔ (۲۱/۵۴)

یقین کرو۔ تم خود بھی اور تمہارے اسلاف بھی صریح گمراہی میں رہے۔

یہ کہا اور اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ تم معاشرہ کی روایات اور اسلاف کی روش کو بطور دلیل پیش کرتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ افرأیتم ما کنتم تعبدون۔ انتم واباؤکم الاقدمون (۲۶/۷۵) کیا تم نے کبھی اس پر غور بھی کیا ہے کہ تم اور تمہارے اسلاف جس روش کے پابند ہو اس کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس مقام پر کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ کوئی روش محض اس لئے صحیح نہیں ہوسکتی کہ وہ اسلاف سے چلی آتی ہے۔ نہ ہی کوئی دلیل اس لئے دلیلِ محکم بن سکتی ہے کہ اسے متقدمین کی سند حاصل ہے۔ تمہیں خود غور کرنا چاہئے کہ اسلاف کی جو روش ہم تک منتقل ہو کر آئی ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اگر وہ صحیح ہے تو اسے جاری رکھو اور اگر غلط ہے تو اسے فوراً ترک کردو۔ یہ ہے صحیح مسلک۔

باپ اور جمہور سے آگے بڑھ کر حضرت ابراہیمؑ معبد کے پجاریوں تک پہنچے۔ یہی لوگ اس زمانے میں استاد، مرشد، اور "خدا کے نمائندے" ہوتے تھے۔ (اور آج بھی ان کی یہی پوزیشن ہے) حضرت ابراہیمؑ نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی تفصیل قرآن کے متعدد مقامات میں موجود ہے۔ ماحصل اس کا یہ ہے کہ انھوں نے اس نوجوان کی اس "بغاوت و سرکشی" کی بنا پر فیصلہ کیا کہ

قالوا حرقوه وانصروا آلهتكم ان كنتم فعلين (۲۱/۶۸)

انھوں نے آپس میں کہا کہ اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس نوجوان کو آگ میں ڈال کر جلا دیں اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔

یہاں تک باپ، قوم کے عام بڑے بوڑھے، اسلاف، معاشرہ کی روایات حتیٰ کہ اساتذہ، علماء، مرشدانِ طریقت، سب آ گئے۔ لیکن ابھی اس سلسلۂ استبداد کی آخری کڑی باقی ہے یعنی بادشاہ۔ حضرت ابراہیمؑ کی حق پرستی اور حق گوئی نے اس کے احترام کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور اسے ایسی کھری کھری سنائیں کہ وہ (قرآن کے الفاظ میں) اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔ (فبهت الذي كفر ۲/۲۵۸)

یہ ہے وہ روشِ ابراہیمی جس کے متعلق قرآن نے ہم سے کہا ہے کہ

قد كانت لكم اسوة حسنة في ابراهيم والذين معه (۶۰/۴)

تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے رفقاء (کی روش) ایک عمدہ نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس روش کو قرآن نے "اسوۃ حسنۃ" قرار دیا ہے، وہ روش یہ نہیں کہ ماں باپ، اساتذہ، مذہبی راہنماؤں، اسلاف، معاشرہ کی روایات اور اربابِ اقتدار کے ہر حکم کا احترام اور ہر فرمان کی تعمیل کرتے جاؤ۔ "اسوۃ حسنۃ" یہ ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہو، وہ کہیں بھی ہو اور کسی کی طرف سے بھی ہو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو۔

حضرتِ ابراہیمؑ کے علاوہ، قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کی روشِ حیات کو بطور "اسوۃ حسنۃ" پیش کیا ہے۔ (لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة)۔ حضورؐ کی روشِ حیات کیا تھی؟ آپؐ کی پیدائش بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح ایسے ہی معاشرہ میں ہوئی جہاں ہر طرف گمراہی پھیلی ہوئی تھی۔ آپ نے اس مروجہ مسلک کی مخالفت اس شدت سے کی کہ قوم کے بڑے بوڑھے، کعبے کے متولی، تمام بزرگ، اکٹھے ہو کر آپ کے چچا[1] کے پاس آئے کہ اس نوجوان کو ان حرکات سے روکا جائے۔ خود چچا نے بھی ان کی ہمنوائی میں آپ سے کہا کہ بزرگوں کا احترام اور اسلاف کی تعظیم بڑی ضروری ہے اس لئے آپ ان کی مخالفت [illegible] آجائیں۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے بھی وہی کچھ کہا جو حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج [illegible] بائیں پر چاند رکھ دیا جائے تو میں پھر بھی غلط بات کی مخالفت سے باز نہیں آؤں گا"۔ اور اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ میدانِ جنگ میں ایک طرف نبی اکرمؐ اور ان کے ساتھی تھے اور دوسری طرف حضورؐ کے یہی بزرگ (چچے وغیرہ) اور ان کی اولاد۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کی ساری زندگی ایک مسلسل جہاد تھی، اپنے معاشرہ کے مسلمات کے خلاف۔ ایک انقلاب آفریں دعوت تھی ان روایات کے خلاف جو ان کے اسلاف سے متوارث چلی آ رہی تھیں۔ اور اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ اور نبی اکرمؐ ہی پر موقوف نہیں بلکہ تمام انبیاءِ کرامؑ کا مشن اُن روایات و تصورات کے خلاف

---

[1] حضورؐ کے والد تو آپ کی پیدائش سے بھی پہلے فوت ہو چکے تھے۔ یہی چچا بمنزلہ والد کے تھے۔

مسلسل پیکار تھا جو اس معاشرہ میں عام ہوتے تھے جن میں وہ مبعوث ہوتے تھے۔ اس میں نہ کسی زندہ کا احترام ان کی راہ میں حائل ہوتا تھا نہ مردہ کا تقدس۔ یہ ہے اس باب میں قرآن کی تعلیم اور حضرات انبیاء کرامؑ کا اسوہ۔

ہم نے کہا یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہو اس کی مخالفت عین فریضۂ زندگی ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حق کسے کہتے ہیں۔ مسٹر بروہی نے گوئٹے کا جو اقتباس دیا ہے اس میں وہ کہتا ہے کہ

احترام کیا جائے ان کا جو ہم سے بڑے (GREATER) اور بہتر (BETTER) ہیں۔

اور خود بروہی صاحب نے لکھا ہے کہ

زندگی میں جو کچھ بھلا (GOOD) اور بڑا (GREAT) ہے اس کا احترام کیا جائے۔

"بھلا اور بڑا" (GOOD AND GREAT) کے الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم متعین نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک ان الفاظ کا مفہوم متعین نہ ہو ان کا واضح تصور سامنے نہیں آسکتا۔ فلسفہ اور اخلاقیات آج تک خیر و شر (GOOD AND EVIL) کے متعلق کوئی حرفِ آخر نہیں کہہ سکے۔ اس لئے ایسے الفاظ کو احترام اور عدمِ احترام کا معیار قرار دینا، قوم کو نظری بحث سے آگے نہیں لے جا سکتا۔ ہمارا تخاطب مسلمانوں سے ہے (اور ظاہر ہے کہ بروہی صاحب کے مخاطب بھی اسی قوم کے نوجوان ہیں) اور مسلمانوں کیلئے خیر و شر اور حق و باطل کا امتیاز بالکل واضح ہے۔ حق وہ ہے جس کا حکم قرآن دیتا ہے اور باطل وہ جس سے وہ روکتا ہے۔ لہٰذا، ایک مسلمان کے لئے احترام صرف قرآنی احکام کا ہے اور اسی بنا پر ان گوشوں کا جہاں سے قرآنی احکام صادر ہوں۔ ماں باپ ہوں یا استاد، اسلاف ہوں یا اخلاف، بزرگ ہوں یا خرد، معاشرہ ہو یا حکومت۔ احترام صرف اس کا ہے جو قرآن کے مطابق حکم دے۔ جو اس کے خلاف حکم دے اس کی مخالفت ایک مسلم کا فریضۂ زندگی ہے اور اتباعِ اسوۂ رسول اللہؐ۔

لہٰذا صحیح مسلک یہ ہے کہ

ماں باپ، اساتذہ، اسلاف کی روایات،
معاشرہ کے ضوابط و قوانین کا احترام نہایت
ضروری ہے بشرطیکہ وہ حق یعنی قرآن کے مطابق ہوں۔

یہی وہ تعلیم ہے جس سے ذہنوں میں جلاء، قلوب میں پاکیزگی، فکر میں بلندی، معاشرہ میں ہماری، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حسنِ توازن اور انسانیت میں ارتقاء پیدا ہوگا۔ یہی چیزیں اس احترام و تعظیم کا موجب بنتی ہیں جس کی سوتیں دل کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہیں۔ احترام کے جذبات دل کے چشموں سے ابھر کر باہر نکلتے ہیں۔ انھیں باہر سے داخل نہیں کیا جا سکتا۔ احترام پیدا ہوتا ہے عظمت کے احساس سے۔ آپ قوم کے نوجوانوں کو قرآن کی تعلیم دیجئے۔ جب قرآن کی عظمت ان کے سامنے بے نقاب ہوگی تو ان کی نگہ عقیدت خود بخود قرآن کی بارگاہ میں جھک جائے گی۔ آپ اپنے ہاں قرآنی معاشرہ پیدا کیجئے۔ جب اس کے درخشندہ نتائج قوم کے سامنے آئیں گے تو اس معاشرہ کی تعظیم و تکریم کے جذبات خود بخود قوم کے دل سے ابھریں گے۔ آپ ان نوجوانوں کے سامنے ایسے

افراد پیش کیجئے جو قرآنی سیرت کے پیکر ہوں پھر دیکھئے کہ انہی نوجوانوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے یا نہیں کہ

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

آپ ان نوجوانوں کو تعلیم تو یہ دیتے ہیں کہ

جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو گرگٹ نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱۵)

اور ان سے پھر توقع یہ رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے اس قسم کے مذہب اور روایات کا احترام کریں؟ آپ ان کے سامنے معاشرہ ایسا پیش کرتے ہیں جس کے متعلق افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ وہ اسے "چار سو بیس" سے تعبیر کر کے بھی مطمئن نہیں ہوتے کہ ان الفاظ نے ان کے جذبات کا کما حقہ اظہار کر دیا ہے۔ اور اس کے بعد ان نوجوانوں سے اس معاشرہ اور اس کے لزوم و تضمنات کی تعظیم چاہتے ہیں؟ آپ ان کے سامنے افراد ایسے پیش کرتے ہیں جن کے تصور سے انسان کو ہنسی آجائے اور ان نوجوانوں کو کہنیاں مار مار کر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انھیں سعادت مآب کہہ کر پکاریں! احترام، اعترافِ عظمت کا نام ہے۔ جہاں عظمت نہ ہو وہاں احترام کس طرح پیدا ہو جائے۔ احترام از خود پیدا ہوتا ہے، پیدا کیا نہیں جا سکتا۔

حقیقت خود کو منواتی ہے، منوائی نہیں جاتی

جو افراد، زمانے سے اپنا احترام کراتے ہیں ان کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ سارے زمانے سے لڑائی مول لیتے ہیں۔ مخالفین کا ہجوم ان سے پوچھتا ہے کہ تمہاری صداقت کی دلیل کیا ہے۔ وہ انہی مخالفین سے کہتے ہیں کہ

قد لبثت فیکم عمرًا من قبله افلا تعقلون۔

میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ایسی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

وہ یہ کہتے ہیں اور مخالفین میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں اٹھتا جو کہنے والے کے کیریکٹر کے متعلق ایک حرف بھی مخالفت میں کہہ سکے۔ یہی نہیں کہ ان کے سامنے ایسا نہ کہہ سکے۔ بلکہ یہ کہ اہلِ مکہ نے ابوسفیان کو اپنا نمائندہ بنا کر ہرقل کے پاس بھیجا کہ وہ اس سے مدد مانگے تاکہ اس تحریک (نبی اکرمؐ کی دعوت) کا خاتمہ کیا جائے۔ ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کہ اس داعیٔ انقلاب کے کیریکٹر کا کیا حال ہے؟ کیا وہ جھوٹ بولتا ہے؟ کیریکٹر کے احترام کی یہ کیفیت ہے کہ ابوسفیان نے وہاں بھی اعتراف کیا کہ اس داعیٔ انقلاب نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی بددیانتی نہیں کی۔ نگاہوں کے سجدے وقف ہوتے ہیں ان افراد کے لئے۔ نہ ان کے لئے جن کی کیفیت یہ ہو کہ

کی جس نے بات اس نے شکایت ضرور کی

احترام ہوتا ہے اس معاشرے کا جس کی حالت یہ ہو کہ جب ایک نومسلم اپنے ٹیکس کا روپیہ خزانے میں داخل کرنے کے لئے لایا تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس نئے (اسلامی) معاشرہ نے تمہارے لئے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس نے کہا کہ ابھی تک تو اس کا موقع نہیں آیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر تم اپنا روپیہ واپس لے جاؤ۔ جب تک کوئی معاشرہ فرد کی ربوبیت کے لئے کچھ نہیں کرتا اسے حق حاصل نہیں ہوتا کہ

وہ اس فرد کی کمائی سے کچھ لے۔ اس معاشرے کا احترام کس طرح ہو سکتا ہے جس کا عالم یہ ہو کہ

دانہ ایں می کارد، آں حاصل برد

معاشرہ تو ایک طرف۔ اس باپ کا احترام اولاد کے دل میں نہیں رہتا جو خود تو مرغ اُڑائے اور بچے بھوکے مریں۔

ہمارے نوجوانوں میں البتہ ایک بات ایسی پیدا ہو رہی ہے جو بڑی معیوب ہے اور جسے کسی صورت میں بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔ اور وہ ہے بدتمیزی۔ ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا نوجوان طبقہ بدتمیز ہوتا جا رہا ہے۔ بدتمیزی کی اجازت کسی حالت میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ وہی قرآن جو حریم کعبہ سے بتوں کو باہر نکال دینے کا حکم دیتا ہے اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ان بتوں کو یا مشرکین کے دیگر معبودانِ باطل کو گالی دی جائے۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (۶/۱۰۹)

جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کو گالیاں مت دو۔ کہ پھر وہ بھی حد سے تجاوز کر کے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بدتمیزی پر اُتر آنا اپنی کمزوری کا اعتراف اور شکست کا اظہار ہے، اور وہ بھی بڑی کمظرفی اور کمینگی کے ساتھ۔ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی کھلے بندوں مخالفت کیجئے۔ لیکن بدتمیزی پر کبھی نہ اتریئے۔ تقدیرِ امم کے مطالعہ سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جس قوم میں قوت باقی نہیں رہتی اس کا عمر رسیدہ طبقہ شکوہ سنجی اور مرثیہ خوانی شروع کر دیتا ہے اور اس کا نوجوان طبقہ بدتمیزی پر اتر آتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور اسی صورت حالات کا احساس ہے جو سنجیدہ طبقے کو یہ کہنے پر مجبور کر رہا ہے کہ

یوں خدا کی خدائی برحق ہے پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

دیکھئے۔ اپنا نمبر خریداری تلاش کیجئے

مارچ ۱۹۵۳ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے لہٰذا آئندہ ماہ اپریل ۱۹۵۳ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ مارچ ۱۹۵۳ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ مارچ سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہو گا۔ فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہو گیا۔

۴۸۵ — ۴۸۴/۲۵۵ — ۴۹۷ — ۷۸۴ — ۷۸۵ — ۷۸۹ — ۸۱۳ — ۸۲۷ — ۸۲۸ — ۸۳۲ — ۸۳۴ — ۸۳۵ —

۸۳۶ — ۸۳۸ — ۸۳۹ — ۸۴۰ — ۸۴۱ — ۸۴۲ — ۸۴۳ — ۸۵۷ — ۸۵۹ — ۸۶۲ — ۸۷۹ — ۹۳۸ — ۱۰۰۸ —

اقوامِ عصرِ حاضر اور اسلام

(رابرٹ مانٹین)

"اگرچہ ایک عیسائی کو اس باب میں احتیاط سے لب کشائی کرنا چاہئے لیکن اسے یہ حق تو ضرور حاصل ہے کہ وہ اپنے اس عقیدہ کا اظہار کردے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی اقدار کا ازسرِنو تعین کیا جائے۔ لیکن قرآنی اقدار کا تعین ناممکن ہے جب تک قرآن کو روایات کی گرفت سے آزاد نہ کرالیا جائے۔ قرآن ایک لعلِ گراں مایہ ہے، لیکن وہ روایات کی قدیم اور مبہم زبان کے نیچے بری طرح دب کر رہ گیا ہے۔ اسے ان مٹی کے تودوں سے باہر نکالنا ہوگا۔"

[رابرٹ مانٹین (ROBERT MONTAGNE) کا زیرِ نظر مقالہ امریکہ کے سیاسی مجلہ ... (FOREIGN AFFAIRS) کی جولائی ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں فاضل مقالہ نگار نے ممالک اسلامیہ کی سیاست کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا ہے اور اس کے بعد وہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ یقیناً اس کی دقتِ نظر، وسعت مطالعہ اور حقیقت بینی کا ثبوت ہے۔ غور کیجئے کہ اس غیر مسلم کی نگاہ کس طرح اس حقیقت تک پہنچی ہے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی اقدار کا ازسرِنو تعین کیا جائے۔ قرآن ایک بیش بہا ہیرا ہے لیکن وہ روایات کے ڈھیر کے نیچے اس بری طرح سے دب چکا ہے کہ اس کی آب و تاب کسی کی نگاہوں کے سامنے نہیں آتی۔ یہ روایات ایک خاص ماحول کی پیداوار تھیں اس لئے قرآن کو ان کے تابع رکھنے سے ہوا یہ کہ قرآن کی ابدیت زمان و مکان میں گھر کر رہ گئی۔ جب تک قرآن کا مفہوم روایات کی روشنی میں متعین کیا جائے گا قرآن کی حقیقت نگاہوں کے سامنے نہیں آسکے گی۔ قرآن کو ان کی گرفت سے آزاد کرانا ضروری ہے۔ اسی سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ ممکن ہے۔ اے کاش آج مسلمانوں کی نگاہیں وہ کچھ دیکھ سکیں جو اس غیر مسلم کی نگاہ نے دیکھا ہے۔ لیکن اس کی نگاہیں حقیقت تک اس لئے پہنچ گئی ہیں کہ ان پر تقلید کی پٹی نہیں بندھی ہوئی اور نہ ہی وہ حسنِ اتفاق سے تعصب کے یرقان سے زرد ہوگئی ہیں۔

تعارف کیلئے اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ مقالہ نگار آج کل پیرس یونیورسٹی میں (ADVANCED MUSLIM STUDEIS) کے سنٹر کا ڈائرکٹر ہے۔ اس سے قبل وہ دمشق میں فرنچ انسٹیٹیوٹ کا ڈائرکٹر اور مراقش میں تعلیماتِ عالیہ کا پروفیسر رہ چکا ہے۔ ذیل میں اس کے مقالہ کا ملخص شائع کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام]

عصرِ حاضر کی تاریخ کا ایک غیر متوقعہ واقعہ ملتِ اسلامیہ کی بیداری ہے۔ انڈونیشیا سے لیکر مراقش اور بحرِ روم سے افریقہ کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی یہ قوم مغربی سیاست کے زیرِ اثر متعدد ممالک میں بٹ چکی ہے۔ اس وقت ان کے چودہ نمائندے اقوامِ متحدہ کے ایوان میں موجود ہیں اور افریقہ اور ایشیا کے راہ نماؤں کی خواہش ہے کہ کم از کم چھ اور نمائندے ان میں شامل ہو جائیں۔ اس بین الاقوامی ادارے کے ایوان میں ان نمائندگان ملتِ اسلامیہ کا سیاسی رویہ کیا ہوگا۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا یہ اپنی علیحدہ انفرادیت قائم رکھ سکیں گے؟ کیا ان کا مطمحِ نگاہ فقط اپنا اپنا ذاتی مفاد ہوگا یا اشتراکِ مذہب اور ثقافت کی بنیادوں پر ایک متحدہ جماعت بنائیں گے؟ یہ سوالات وہ ہیں جنھوں نے آج کل دولِ مغرب کو پیچ و تاب میں ڈال رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سوال صرف اتنا ہی نہیں کہ اقوامِ متحدہ کے ایوان میں ان نمائندگان کی اتنی بڑی تعداد، میزانِ سیاست کا پلڑا جدھر جی چاہے جھکا دیا کرے گی۔ بلکہ یہ کہ ان کی وجہ سے خود مغربی قوتوں کی کشتیٔ سیاست ڈولنا ڈول ہو رہی ہے اس لئے کہ ان مسلمان قوموں کے پاس فوجی اور قدرتی ذرائع کا اتنا بڑا خزانہ ہے اور اس کے ساتھ ہی انھیں جغرافیائی پوزیشن بھی ایسی حاصل ہے کہ اقوامِ اطلانطک کا مستقبل براہِ راست نہیں تو بالواسطہ انہی کے ہاتھوں میں نظر آتا ہے۔

مشرق کی اقوامِ جدید وطنیت (یا قومیت) اسلام کے مزاج کے خلاف ہے اور ان اسلامی ممالک میں بھی، جو دورِ حاضر میں وجود پذیر ہوئے ہیں، مسلمان فقہا کے نزدیک وطنیت (یا قومیت) ایک بدعت ہے۔ جب ہم "نیشن" کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد ہوتی ہے انسانوں کا ایک گروہ، جو خاص خطۂ ارض میں بستا ہو۔ جہاں تمام انسان آزاد ہوں اور نسل اور مذہب کے امتیاز کے بغیر قانون کی نگاہ میں مساوی۔ جو اپنے لئے اپنا قانون آپ وضع کریں اور اپنے تاریخی مستقبل کا شعور رکھتے ہوں۔ اس کا عمود، مملکت ہوتی ہے جو انتظامی ربط و نظام سے قائم رہتی ہے اور جو آبادی کے اضافے اور دوسری قوموں سے مقابلہ کی بنا پر اپنے معاشی اور معاشرتی تقاضوں کو حالات کے مطابق ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ اس کی توانائی، ان اخلاقی اور مادی قوتوں کو مہیا کرتی ہے جن پر اس کے داخلی اور خارجی تحفظ کا مدار ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی تہذیب، قومیت کے ان عناصر سے ناآشنا ہے۔ اسلامی شریعت میں سیاست اور کلیسا کی تفریق کی قطعاً گنجائش نہیں۔ یہ شریعت صدیوں سے مسلمانوں کی معاشی، سیاسی اور عائلی زندگی کو محیط چلی آ رہی ہے۔ اس کا اقتدار اس بنا پر مسلّم ہے کہ اس کی بنیاد خدا کی اس کتاب پر ہے جس میں منشائے ایزدی نہایت وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان صرف انہی معاملات میں قانون سازی کا اختیار رکھتے ہیں جن میں ان کی یہ کتاب خاموش ہو، اور ایسے معاملات کی تعداد بہت کم ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا نظامِ حکومت تھیاکریسی پر مبنی ہے تو مسلمان اس پر چیں بجبیں ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں پیشوائیت کا تصور نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحی کو شریعت کا ماخذ قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ قوم کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کو اللہ کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ لوگوں کی دنیاوی تقدیر ابدی صداقتوں کے ماتحت رہے۔[1]

---

[1] اگر تھیاکریسی سے یہی مفہوم ہے تو ہمیں تسلیم ہے (اور اس پر فخر) کہ اسلام کا نظامِ حکومت "تھیاکریسی" ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں قانون سازی کیلئے مذہبی پیشواؤں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے تو یہ ملا کا مذہب ہے۔ اسلام نہیں ہے (طلوعِ اسلام)

اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں نے کیوں اپنے انفرادی تشخص کو آزاد قانون سازی کے ذریعے مشہود نہیں ہونے دیا۔ جن لوگوں نے ایسا کرنا چاہا انھیں اسلام کے حلقہ سے باہر نکل کر الگ مذاہب قائم کرنے پڑے۔

بایں ہمہ مسلمانوں کی ساری تاریخ اس کشمکش کا مرقع ہے جس میں بادشاہ اور فقہاء ایک طرف ہوتے تھے اور وہ باغی قبائل دوسری طرف جو اپنی آزاد حکومتیں قائم کرنا چاہتے تھے۔ بادشاہوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ رسوم و رواج جن کے مطابق یہ قبائل اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، ظہورِ اسلام سے پہلے عہدِ جاہلیت کی یادگار ہیں (اور اسلام کے بعد انھیں باقی نہیں رکھا جا سکتا) مغرب نے ہمیشہ اس تاریخی کشمکش کو نظر انداز کیا ہے۔ (حالانکہ اس کے اثر اور اہمیت کا یہ عالم ہے کہ) ازمنۂ گذشتہ کو تو چھوڑیئے، اس نے آج (بیسویں صدی میں) بھی مسلمانوں کی اس داخلی وحدت کو مفلوج کر رکھا ہے جن کی بنا پر ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک نظم پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کا نظم جو آٹھویں صدی سے قبل یورپ میں پایا جاتا تھا اور جو وحشی قبائل کے حملوں سے بگڑ گیا جو سلطنتِ روما کی شکست و ریخت کا موجب بنے۔

اسلام میں ہر مسلمان، وہ کہیں بھی ہو، ایک جیسی شرائط اور ایک ہی قانون کے مطابق ہر مسلمان حکومت کے ماتحت زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں حدودِ مملکت کا تصور، کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا اور ملت خواہ کتنی ہی عارضی یا مستقل مملکتوں میں بٹ جائے، اس کی وحدت باقی رہ سکتی ہے۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، وہ اسلامی تہذیب جو بارہویں صدی میں اس قدر تابناک تھی، وہ اس وقت جامد ہو کر رہ گئی جب ہماری تہذیب (مغرب) نے ابھرنا شروع کیا۔ انیسویں صدی میں، دولِ مغرب کی وسعتوں سے مسلمانوں کو اپنی ان کمزوریوں کا احساس ہوا جو ان کے تمدن میں مضمر تھیں اور اس کے ساتھ ہی انھیں اپنی عسکری اور معاشی واماندگی کی بنا پر مستقبل کے متعلق خطرہ بھی محسوس ہوا۔ ان میں سے جو ذرا زیادہ وسعتِ نگاہ رکھتے تھے انھوں نے اپنی شوکت رفتہ کی بازیابی کے لئے یہ سوچا کہ مغرب کے فنی طریقوں کی تقلید کی جائے۔ ان میں سے جو زیادہ گہری نظر رکھتے تھے انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ محض فنی طریقِ کار کی تقلید اس مقصد کے لئے کافی نہیں ہو گی۔ اس کے لئے سیاسی بساط میں تبدیلیوں کی بھی ضرورت ہے یہ کوششیں زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکیں۔ اس لئے کہ ان معلمین نے قالب تو مغربی اختیار کر لیا لیکن روح وہی مشرقی رکھی۔ ظاہر ہے کہ ازمنۂ متوسط کی یہ مذہبی روح، مغرب کے قالب کے ساتھ امتزاج رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی (۱۸۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء کے بعد تک) ان ممالک میں وہ ردِ عمل شروع ہوا۔ جس کی بنیاد مسلمانوں کا اپنے ماضی پر فخر و ناز تھا۔ ان روایت پسندوں نے کہا کہ مغرب کی ترقی محض مادی ہے مسلمانوں کے تنزل کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے عقائد میں کمزوری آ گئی ہے جس کی وجہ سے یہ خدا کے غضب کے مستوجب بن گئے ہیں۔ انھوں نے قدیم اسرائیلی فقہاء کی طرح یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر مسلمان اپنے عقائد درست کر لیں تو اسلام کی عظمتِ رفتہ خود بخود لوٹ آئے گی۔ یہ عقیدہ آج بھی عوام اور خواص دونوں میں رائج ہے اس لئے مسلمان اس حسین خواب میں مست ہے کہ دورِ حاضر کی عارضی تہذیب کے مٹ جانے کے

بعد اسلام کے ماضی کی تابناکی خود بخود پلٹ آئے گی۔

۱۹۱۸ء میں ترکی کی خاکستر سے ایک ایسی چیز نے ابھرنا شروع کیا جو مشرقی مسلمانوں کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ مغرب نے وطنیت اور قومیت کے تصور کو عام کیا اور اس طرح کوشش کی کہ جغرافیائی حدود کی بنیادوں پر قدیم مملکتوں کا استحکام پیدا کیا جائے۔ دولِ مغرب نے اسلامی ممالک کو اس جدید تجربہ کی آماجگاہ بنایا اور عین قلب اسلام میں کم از کم سات قوموں کے الگ الگ حدود متعین کر دیئے جن میں سے ایک اسرائیلی مملکت بن گئی۔ عربوں کے بعض مدبرین نے اس تحدید اور قطع و برید پر تنقید بھی کی۔ یہ وہ تھے جو ابھی تک پرانی اموی اور عباسی حکومتوں کے خواب دیکھ رہے تھے اور اس حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ عربی قبائل کی طبیعت اور مختلف خاندانوں کی رقابت ایک مرکز کے تابع رہنے پر رضامند ہو نہیں سکتی۔ اس لئے اب امیہ اور عباسیوں جیسی وسیع و عریض سلطنتوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ ان کے ان تصورات کے بادل چھٹ گئے۔ اور تیس سال کے عرصے میں جدید قومیت کی تشکیل کی اسکیم کو ایک حد تک کامیابی ہو گئی۔ اس دوران میں کم از کم عراق، شام اور لبنان کے تین خطوں نے اپنے آپ کو تین جداگانہ مملکتوں میں تبدیل کر لیا ہے۔ ان میں سے دو مملکتوں نے فرانسیسی انداز کی جمہوری حکومتیں قائم کیں اور تیسری نے انگریزی انداز کا آئین اختیار کر لیا۔ مصر جس نے ۱۹۳۶ء میں آزادی حاصل کی تھی، دوسری جنگِ عظیم کے بعد، تمام عربی اقوام میں سب سے زیادہ طاقتور دکھائی دینے لگا چنانچہ اس نے مشرق وسطیٰ اور افریقہ میں قائد کی سی پوزیشن حاصل کر لی۔ البتہ سعودی عربیہ اور یمن میں وہی پرانے دساتیر کارفرما رہے۔ وہی شخصی حکومتیں جو قبائلی مفاد پرستوں کو اسلامی قوانین کی اتھارٹی کے نام سے باہم دگر یا ندھے رکھتی ہیں اور کسی فکری تجدید کو اپنے ہاں بار نہیں پانے دیتیں۔

ان تنگ حدود کے اندر دولِ مغرب کی کوششیں ۱۹۴۷ء تک بار آور ہوتی رہیں۔ انھوں نے ان اسلامی ممالک میں جو قومی یا وطنی حدود متعین کی تھیں ان کا احترام کیا گیا۔ حتیٰ کہ جو سامان ایک ملک سے دوسرے ملک میں آتا جاتا رہا اس پر جنگی کے قانون عائد ہوتے رہے۔ (یعنی ان حدود کے اندر مختلف اسلامی ممالک نے، دوسرے حدود کے اندر اسلامی ممالک سے بالکل ایسا ہی برتاؤ کیا جیسا خارجی ممالک سے کیا جاتا ہے) دوسرے اسلامی ممالک سے تو انھوں نے اس قسم کا برتاؤ کیا لیکن خود اپنے ملک کے اندر غیر مسلم اقلیتوں کا مذہبی اور ثقافتی تحفظ کیا۔ یہانتک کہ جب پچھلے دنوں یہ تجویز پیش ہوئی کہ شام میں مملکت کا مذہب اسلام قرار دیدیا جائے تو غیر مسلم مذہبی اداروں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ یہ ایک ایسی آواز تھی جو آج سے چالیس سال قبل اٹھتی تو کوئی مسلمان بھی اسے سننے کے لئے آمادہ نہ ہوتا۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ دولِ مغرب نے ان ممالک میں قومیت پرستی کی روح کو اس درجہ حلول کر دیا کہ ایک ملک کے اندر بسنے والے مسلم اور غیر مسلم تو ایک قوم کے افراد تصور ہونے لگے اور اس ملک سے باہر کے مسلمان غیر قوم کے افراد۔ یہی دولِ مغرب کا منشا تھا کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مذہب نہ رہے وطنیت بن جائے۔ اسی میں وہ کامیاب ہو گئے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی وحدت مختلف وطنوں میں بٹ گئی۔

لیکن اس سے بھی آگے "ان ممالک نے جس گوشے میں مغربی ممالک کی سب سے زیادہ تقلید کی ہے وہ قانون سازی کا مسئلہ ہے

اس باب میں مغربی انداز فکر آہستہ آہستہ مسلمانوں پر اثر انداز ہوتا چلا جا رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب بہت سے مقامات پر (خالص اسلامی شریعت کے بجائے) مخلوط ضوابط قانون رائج ہو رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں ترقی کی رفتار ایسی تیز نہیں جیسی اتاترک کی وجہ سے ترکی میں رونما ہوئی تھی لیکن پھر بھی یہ تبدیلی کچھ کم نمایاں نہیں۔ یہ ممالک رفتہ رفتہ اسی سمت جا رہے ہیں جس سمت مغرب کے ممالک گئے ہیں۔

قانون کے علاوہ ثقافت کے مختلف شعبوں میں بھی مغرب کی تقلید کچھ کم نمایاں نہیں بالخصوص تعلیم کے مسئلے میں۔ اسی طرح اقتصادیات کے معاملے میں بھی انھوں نے کافی حد تک مغرب کی پیروی کر لی ہے۔ ان کوششوں کا نفسیاتی نتیجہ بالکل ظاہر ہے۔ ان حدود کے اندر مختلف ممالک میں نہایت شدید قسم کے "محبانِ وطن" پیدا ہو چکے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان ممالک میں اتحاد (بلکہ وحدت) کا جذبہ اب بھی پایا جاتا ہے لیکن جہاں مفاد کے تصادم کا خطرہ ہوتا ہے ہر مملکت اپنے اپنے مفاد کو مقدم سمجھتی ہے اور اگر کوئی ہمسایہ اسلامی ملک اس کے کسی معاملہ کے متعلق کوئی مشورہ یا رائے دیتا ہے تو وہ مملکت اسے دخل در معقولات سے تعبیر کرتی ہے۔ یہ کایا بیاں اگرچہ محدود سی ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکے گا کہ ان سے جذبۂ قومیت کی جڑیں کافی گہرائی تک جا چکی ہیں۔

داخلی انتشار

لیکن ان "خوشگوار" توقعات کے ساتھ ہی ایک تاریک پہلو بھی ہے جس نے ان ممالک کی وطنی زندگی کو کافی حد تک مکدر کر رکھا ہے۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۵ء تک ان ممالک پر اس تعلیم یافتہ طبقہ کا اثر رہا جس نے فرانسیسی، امریکی اور برطانوی درسگاہوں اور اداروں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی زیر قیادت ان ممالک میں سیاست اعتدال پسندانہ انداز پر چلتی رہی لیکن ۱۹۳۵ء کے بعد جب یورپ میں نازی اور فاشستی قسم کی آمرانہ تحریکوں نے سر ابھارنا شروع کیا تو ان ممالک کے نوجوانوں نے بھی اعتدال پسندی کو چھوڑ کر دہشت انگیزی کی متشددروش اختیار کر لی۔ ہر جگہ ان کی انجمنیں بن گئیں۔ بالخصوص مصر میں اور ان طالب علموں بستیوں میں سندیں حاصل کرنے کی بجائے سیاسی بساطوں کو الٹنا شروع کر دیا۔

لیکن ان حالات کا سارا الزام ان نوجوانوں کے سر پر ہی عائد نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی انداز کی معاشی ترقی کا براہ راست نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کی مراعات کے زور پر دولت مندوں کا طبقہ بہت زیادہ دولت مند ہو جاتا ہے اور غریبوں کا طبقہ حد سے زیادہ غریب۔ جب ان کی غربت اور افلاس حد سے بڑھ جاتی ہے اور ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے تو یہ طبقہ ملک کی سیاست پر اثر انداز ہوتا ہے اس کا نتیجہ اندرونی خلفشار کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

پان عرب تحریک

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اتحادِ ممالک عربیہ (پان عرب ازم) کی تحریک کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس وقت وہ محض ذہنوں کے اندر گردش لے رہی تھی ۱۹۳۲ء میں عبدالرحمٰن نے اپنا منشور شائع کیا جس نے اس خیال کے عام کرنے میں بڑی مدد دی۔ ادھر یہ خیال عام ہوا اور ادھر سیاسی مہرہ اسے اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ عراق کے شاہ فیصل نے اسے اپنے مفاد کے لئے اپنانا چاہا، شام نے اپنے مفاد کے لئے۔ ۱۹۴۳ء میں

مصری سیاستدانوں نے اسے اپنے مطلب کے لئے تقویت دی اور اسی نے بالآخر عرب لیگ کی شکل اختیار کرلی۔ ادھر دول یورپ بھی اسے اپنے مفاد کا آلۂ کار بنانے کی فکر میں تھیں، بالخصوص برطانیہ۔ عرب لیگ بننے کو تو بن گئی لیکن عربی ممالک نے عملاً کسی نقطہ پر بھی ایک دوسرے سے تعاون نہیں کیا۔ ایک تو یہ وجہ، اس کے ساتھ ہی فلسطین کا حادثہ۔ پھر اندرونی سازشیں اور ریشہ دوانیاں۔ ان وجوہات کی بنا پر "عرب لیگ" اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں کرسکی جس کے لئے اس کی ہستی ظہور میں آئی تھی۔ سیاسی قتل اور خفیہ ریشہ دوانیاں، مسلمانوں کی تاریخ کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔ گذشتہ عالمگیر جنگ کے بعد ان سازشوں اور فتنوں نے عربی ممالک میں خاصی تیزی اور شدت اختیار کرلی ہے۔ اور ان کی وجہ سے ان کی سالمیت خطرناک حد تک مخدوش ہوگئی ہے۔ ان کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ جو ممالک ابھی تک ان فتنوں سے ناآشنا تھے، ان تک بھی ان شعلوں کی لپٹ جا پہنچی ہے۔ تونس میں "نو دستور" کا سیاہ ہاتھ ۱۹۵۲ء میں پھر نمودار ہوگیا ہے جس نے ۱۹۴۰ء میں جرمنی اور اطالوی روپے کے زور پر جنم لیا تھا۔ الجیریا میں وہاں کی مقبول عام پارٹی نے مظاہرے شروع کردیئے ہیں۔ تنجیر میں بہت سے فسادات ہوچکے ہیں۔ ان تمام فسادات میں تشدد پسند وطن پرست، مذہبی دیوانے اور کمیونسٹ کچھ اس طرح مدغم ہورہے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے متمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

پان اسلام ازم کی تحریک جدید

عرب لیگ کی ناکامی نے عوام اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی امیدوں کو پامال کردیا ہے بعض مسلمان مفکرین کا خیال ہے کہ قوم کو مایوس کن حالات سے باہر نکالنے کا طریقہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ حال کے تلخ حقائق کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرکے انھیں پھر سے ماضی کے درخشندہ خوابوں کی دنیا میں لے جایا جائے۔ ایسے خوابوں میں تسکین پالینا عرب ذہنیت کی خصوصیت ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر عرب لیگ کی ناکامی کے بعد اب عالمگیر اتحادِ اسلامی کی رَو پھر سے مائل بہ حرکت ہورہی ہے۔ اس کا پہلا محرک جذبہ مسئلہ فلسطین کو بتایا گیا ہے۔ پاکستان نے اپنے آپ کو اس تحریک کا مرکزی مقام بننے کے لئے پیش کردیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے کراچی میں فروری ۱۹۴۹ء ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء میں مختلف بین الاسلامی اجتماعات منعقد ہوئے ان اجتماعات میں بھی (پان عرب ازم کی طرح) مختلف مکاتیب خیال کے لوگ باہمی تعاون کے لئے جمع ہوئے جن لوگوں نے اس تحریک کی ابتداء کی وہ عصر حاضر کے دنیائے اسلام کے غالباً سب سے زیادہ وسیع النظر اور کشادہ ذہن واقعہ ہوئے ہیں۔ یہ حلقہ ڈاکٹر سر اقبال (مرحوم) کے عقیدتمندوں کا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب وہ جمود ہے جو دین کے تفقہ کے معاملہ میں مسلمانوں پر صدیوں سے چھایا ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر جسد ملت کو تقلید اور جمود کی ان زنجیروں سے آزاد کردیا جائے تو مسلمانوں میں بڑا صالح انقلاب نمودار ہوسکتا ہے۔ ان کی یہ آرزوئیں اس قابل ہیں کہ ان کی تائید کی جائے لیکن کراچی کے اجتماعات میں ان کے گرد وہ متقلد و جامد طبقہ جمع ہوگیا جو دین میں ذرا سی اصلاح اور ترمیم کو ارتداد سمجھتا ہے اور جنھوں نے پاکستان میں ایک ایسے آئین کو مسترد کردیا ہے جس میں عصر حاضر کے تقاضوں کی رعایت رکھی گئی تھی۔ ان لوگوں کی تائید مصر اور مراکو کے انہی جیسے مقلدین نے کی۔ ان حالات میں ان اجتماعات میں جو ریزولیوشن پاس ہوئے وہ بالکل واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلامی ممالک سے یورپ کے کلچرل مشنز کو باہر نکال دیا جائے اور دوسرے یہ کہ نسل و وطن کے حدود کو توڑ کر

عالمگیر اسلامی قومیت کی بنیاد ڈالی جائے۔ اصل یہ ہے کہ جب اسلامی ممالک کے یہ نمائندے محسوس کرتے ہیں کہ یورپین ممالک مادی دنیا میں اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ اس میدان میں ان کا مقابلہ ناممکن ہے تو یہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ وہ قومیں مادی قوتوں میں تو بیشک ہم سے آگے ہیں لیکن روحانی ترقی اور مذہبی افضلیت میں ہمارا مقابلہ کبھی نہیں کر سکتیں۔ اس لئے وہ اپنی نگاہوں کا رُخ اس دوسری سمت پھیر لیتے ہیں۔

توقعات وہ لوگ جو مستقبل سے خوش آئند توقعات رکھتے ہیں شاید یہ کہیں کہ صورتِ حالات کے اس تجزیئے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اس کا اہل ہی نہیں کہ وہ دورِ حاضرہ کی تہذیب میں کچھ بھی موثر حصہ لے سکے۔ جو لوگ روحانی اقدار میں یقینِ محکم رکھتے ہیں دل سے چاہتے ہیں کہ اسلام تشکیلِ تہذیب میں مؤثر حصہ لے۔ لیکن انھیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ زیادہ یقینی نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مسلمانوں نے سیاستِ مدن اور معیشت میں مغرب کی ٹکنیک سیکھ لی ہیں اور انھیں اپنے ہاں رائج بھی کر رہے ہیں مگر ان کے دل و دماغ پر ابھی تک ازمنۂ وسطیٰ کے تصورات چھائے ہوئے ہیں اور وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کی ترقی کا راز انہی تصورات سے وابستگی میں پوشیدہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبے بیک وقت آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اگرچہ ایک عیسائی کو اس باب میں احتیاط سے لب کشائی کرنا چاہیئے لیکن اسے یہ حق تو ضرور حاصل ہے کہ وہ اپنے اس عقیدہ کا اظہار کر دے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی اقدار کا از سرِ نو تعین کیا جائے۔ لیکن قرآنی اقدار کا تعین ناممکن ہے جب تک قرآن کو روایات کی گرفت سے آزاد نہ کرا لیا جائے۔ قرآن ایک لعلِ گراں مایہ ہے لیکن وہ روایات کی قدیم اور مبہم زبان کے نیچے بری طرح دب کر رہ گیا ہے اسے مٹی کے ان تودوں سے باہر نکالنا ہوگا۔

[آپ نے غور فرمایا کہ ایک غیر مسلم مورخ اور مفکر کے نزدیک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا راز کس چیز میں پوشیدہ ہے؟ قرآن کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے میں۔ اسی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا راز مضمر ہے . . . . . .

اور اسی میں تمام نوعِ انسانی کی فلاح و ارتقا کا راز۔ جب تک اس شجرِ مقدس سے عجمی روایات کی اکاس بیل الگ نہیں کی جاتی، اس کے بڑھنے، پھولنے اور پھلنے کی کوئی صورت نہیں۔ ان روایات کے متعلق دیکھئے کہ ایک غیر مسلم صاحبِ قلم کیا کہتا ہے]

ENCYCLOPEDIA OF THE SOCIAL SCIANCES میں اسلام سے متعلق مضمون کا مقالہ نگار لکھتا ہے:۔

رسول اللہ کے بعد یہودی، نصرانی اور ایرانی تصورات نے اسلامی عقائد و نظریات کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اسلام کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ایک منفرد مذہب ہے۔ اب ان حالات کے ماتحت اسے اپنے اس دعوے کو برقرار رکھنے کیلئے اسکے سوا چارہ ہی نہ تھا کہ وہ ان غیر اسلامی اثرات کے متعلق یہ اعلان کر دے کہ یہ روایات خود رسول اللہ سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں اس طرح پہلی چند صدیوں میں جو کچھ اسلام میں باہر سے داخل ہوا وہ احادیث نبوی کی مہر لگ کر عین اسلام بنتا چلا گیا۔ نویں صدی عیسوی میں انہی روایات کے مجموعے مرتب ہو کر اسلام کا مستقل ماخذ بن گئے چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ جن امور کی رسول اللہ نے سب سے پہلے تبلیغ کی تھی وہ بھی اسلام ہے اور جو کچھ اس میں بعد میں شامل ہو گیا وہ بھی اسلام۔ حتیٰ کہ جو کچھ آج عوام میں ہو رہا ہے وہ سب اسلام ہے!

[اے کاش! جو کچھ غیروں کو نظر آ گیا ہے وہ کہیں خود مسلمانوں کو بھی نظر آ جائے۔ نظر تو آ سکتا ہے بشرطیکہ ملا کا افسوں اُٹھ جائے۔ طلوع اسلام]

بھولی ہوئی کہانیاں

طلوعِ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں تمام افرادِ انسانیہ کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاکر نقطۂ تکمیل تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس کا تمام نظام ربوبیت ہے۔ اس نظام کی رو سے معاشرہ تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ اور افرادِ معاشرہ اپنی محنت کا ماحصل معاشرہ کی تحویل میں دیدیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں انفرادی طور پر دولت جمع کرکے اپنے پاس رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کبھی دولت اپنے پاس رکھی بھی جاتی ہے تو بطور امانت صرف اس وقت تک کیلئے جب تک معاشرہ اسے طلب نہ کرلے۔ یہ نظام تھوڑے سے وقت کیلئے قائم ہوا۔ اس کے بعد حقیقی اسلام کی جگہ اس اسلام نے لی جسے غیر اسلامی قوتوں نے وضع کیا اور جو آج تک مسلمانوں میں رائج چلا آرہا ہے۔ یہ اسلام دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ، اس لئے نظامِ سرمایہ داری کا حامل ہے۔ اور ملائیت کی کوششوں کے سہارے قائم ہے۔

طلوعِ اسلام اپنے اس دعوے کی تائید میں قرآن پیش کرتا ہے لیکن مُلا قرآن کی تکذیب میں تاریخ کو پیش کرتا ہے جو خود دورِ ملوکیت میں لکھی گئی۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھو تاریخ میں بڑے بڑے صحابہؓ دکھائی دیتے ہیں جن کے پاس انبار در انبار دولت جمع تھی۔ ان پر صرف زکوٰۃ واجب تھی جس کے بعد دولت کے تمام ڈھیر پاکیزہ اور طیب ہوجاتے تھے۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن ایک یقینی حقیقت ہے اور تاریخ ظنی۔ اسلئے تاریخ کے اسی بیان کو یقینی سمجھنا چاہئے جو قرآن کے مطابق ہو۔ مُلا اس پر ناک بھوں چڑھاتا ہے اور طلوعِ اسلام کو کبھی منکرِ حدیث بتاتا ہے اور کبھی اسے اسلاف کی تنقیص کے جرم سے متہم کرتا ہے۔

اگرچہ، جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، ہماری تاریخ دورِ ملوکیت کی ترتیب دادہ ہے اور اس لئے نظامِ سرمایہ داری کی موئید، لیکن اس میں کہیں کہیں ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جن سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے ہی میں اسلامی معاشرہ خارجی عناصر سے متاثر ہونے لگ گیا تھا اور آہستہ آہستہ اپنے مقام سے ہٹ رہا تھا۔ صحابہ میں سے بعض حضرات اس تغیر کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے اور اس کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ انہی میں حضرت ابوذر غفاری کی شخصیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے جن کے بعض کوائف حیات کو تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔

آپ رسول اللہ صلعم کے عزیز ترین صحابہ میں سے ہیں۔ حضور کے بعد حضرات شیخین کی خلافت میں بھی اسی جذب و انہماک سے مصروفِ سعی و عمل رہے جس طرح نبی اکرم صلعم کی زندگی میں مصروفِ جہاد رہتے تھے۔ آپ نے نہ کبھی صدیق اکبرؓ پر کوئی نکتہ چینی کی نہ عمر فاروقؓ پر۔ دونوں کے جاں نثار مطیع و فرمانبردار معین و مددگار۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں محاذِ شام پر مصروفِ جہاد تھے۔ آپ کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ میں تشریف لائے ہیں۔ مسجدِ نبوی ہے اور یہ ہیں ہر وقت تلاوت و تبلیغ قرآن سے کام ہے۔ خلافتِ حضرت عثمان کا زمانہ ہے۔

دیکھتے دیکھتے چند ہی سال میں مدینہ کی حالت میں زبردست تبدیلی آچکی ہے۔ جہاں صحابہؓ کے کچے جھونپڑے تھے وہاں اب پختہ اور عالیشان محلات تیار ہو رہے ہیں۔ حضرت زبیرؓ، طلحہؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بڑی بڑی زمینیں اور مکانات خرید لئے ہیں۔ سعد بن ابی وقاصؓ نے وادی عقیق میں ایک بلند شان مکان تعمیر کرالیا ہے جس کا صحن کافی وسیع اور اوپر کی منزل پر سر طرف دریچے ہی دریچے ہیں۔ ایک دن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے افریقہ کے خراج کا پانچواں حصہ (جو بیت المال کا حق تھا) مروان ابن الحکم کو بخش دیا ہے۔ دوسرے دن سنتے ہیں کہ آپ نے حارث ابن ابی العاص کو تین لاکھ درہم بخش دیئے ہیں۔ چند روز بعد معلوم ہوتا ہے کہ زید ابن ثابتؓ کو ایک لاکھ درہم عطا فرما دیئے گئے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ مسجد نبوی میں پہنچتے ہیں اور بآواز بلند اس آیت کریمہ کی تلاوت شروع کر دیتے ہیں:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ( )

جو لوگ چاندی اور سونے کو جمع رکھتے ہیں اور اسے مفاد عامہ کے لئے کھلا نہیں رکھتے سو انہیں سخت سزا کی خبر دیدیجئے۔

مروان بن الحکم کو اطلاع ملتی ہے کہ ابوذر غفاریؓ اسے اور حضرت عثمانؓ کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ وہ حضرت عثمانؓ سے شکایت کرتا ہے۔ حضرت عثمانؓ نائل (اپنے خادم) سے کہتے ہیں کہ ابوذرؓ کو بلا لاؤ۔ ابوذر غفاریؓ حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ ناراضگی کے لہجہ میں فرماتے ہیں:

—— ابوذر! مجھے جو کچھ تمہارے متعلق پہنچ رہا ہے اس سے باز آجاؤ۔

—— امیر المومنین آپ کو میرے متعلق کیا باتیں پہنچ رہی ہیں؟

—— میں سن رہا ہوں کہ تم لوگوں کو میرے خلاف بھڑکاتے ہو۔

—— یہ کیسے؟

—— تم مسجد میں بیٹھ بیٹھ کر والذین یکنزون الذہب والفضۃ نہیں پڑھتے رہتے؟

—— کیا عثمان مجھے کتاب اللہ کی تلاوت سے اور جن لوگوں نے خدائی احکام کو چھوڑ دیا ہے ان پر نکتہ چینی کرنے سے روک سکتے ہیں؟ خدا کی قسم اگر عثمان کو ناراض کر کے میں خدا کو راضی کر سکوں تو مجھے وہ اس سے کہیں زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں خدا کو ناراض کر کے عثمان کو راضی کرنے کی کوشش کروں۔

آثارِ غضب حضرت عثمانؓ کے چہرہ پر ہویدا تھے مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دیں۔ حضرت عثمانؓ خاموش ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ ابوذرؓ وہاں سے چلے آئے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ یہ وہی ابوذرؓ ہیں، جن کی تمام زندگی جہاد میں گذری۔ جو کبھی نہ خلافت کے امیدوار ہوئے نہ کسی ملک کے گورنر بنے، یہ وہی ابوذر ہیں جن کے گھر میں ایک مہمان آگیا۔ اندر پہنچا تو ہر طرف نظر دوڑائی مگر گھر میں گھر کا سامان کچھ نظر نہ آیا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے پوچھ ہی لیا۔

—— ابوذر! آپ کا سامان کہاں ہے؟

—— ہمارا ایک دوسرا گھر بھی ہے اپنا اچھا اچھا سامان ہم وہاں بھیجدیا کرتے ہیں۔

ـــــ جب تک آپ اِس مکان میں ہیں آپ کو یہاں بھی تو سامان کی ضرورت ہے۔

ـــــ مالک مکان ہمیں اس مکان میں زیادہ رہنے نہیں دے گا۔

یہ وہی ابوذرؓ ہیں جو آج تک اطاعت و فرمانبرداری کے مجسمہ تھے مگر آپ نے امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کا مکالمہ سُنا۔ اسلام میں عجمیت کسی راستے سے بار پا رہی تھی؟ یہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کس طرف سے داخل ہو رہی تھی، یہ بھی دیکھ لیجئے:۔

امیر المومنین حضرت عثمانؓ اپنے مکان میں تشریف فرما ہیں۔ پاس ہی کعب الاحبار بیٹھے ہوئے ہیں۔ دونوں کے درمیان علمی مذاکرات ہو رہے ہیں۔ ابوذر غفاریؓ بھی امیر المومنین کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں یہ کعب الاحبار کون بزرگ ہیں؟ یہ دراصل ایک یہودی عالم ہیں جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور ہماری تفسیری روایات کا سب سے بڑا ستون ہیں ـــــ ابوذر غفاریؓ دونوں کو سلام کرتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ ذرا سنئے اس وقت کیا مسئلہ زیر گفتگو ہے۔

(حضرت عثمانؓ)۔ کیا امام کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ بیت المال سے بطور قرض کے کچھ رقم لے لے اور جب فراغت ہو ادا کر دے؟

(کعبؓ) اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ابوذر غفاریؓ تاب خموشی نہ لا کر درمیان میں بول اٹھتے ہیں۔

ـــــ یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔

ـــــ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ـــــ یہودی عورت کے بیٹے! تیری یہ مجال کہ تو ہمیں آج دین کی تعلیم دینے کے لئے کھڑا ہوا ہے۔

کعبؓ نے فریاد کیلئے حضرت عثمانؓ کی طرف دیکھا تو آپ نے حضرت ابوذرؓ سے تخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ـــــ تمہاری ایذا رسانی اور میرے اصحاب پر طعن و تشنیع دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

گفتگو نے تیزی اختیار کر لی اور دیر تک دونوں میں تیز تیز گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ آخر فیصلہ کن انداز میں حضرت عثمانؓ نے حکم صادر فرما دیا،

ـــــ تم ملک شام چلے جاؤ!

آپ نے سمجھا مسئلہ زیر بحث کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے خلیفہ ہوتے ہی تمام مسلمانوں کے عطایا میں اضافہ کر دیا تھا اور اس کے بعد امراء و اشراف کو بڑے بڑے گرانقدر انعامات بھی دیئے جاتے تھے۔ بیت المال میں اس مد کی جو رقم ہوتی تھی وہ کم پڑنے لگی۔ حضرت عثمانؓ نے چاہا کہ صدقات کی مد سے جو خالص غربا و مساکین کا حق تھا اور جس کے مصارف خود قرآن کریم نے متعین کر دیئے ہیں، کچھ رقم بطور قرض منتقل کر لی جائے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی نظر بڑی دور رس تھی۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ اگر یہ دروازہ کھول دیا گیا تو آج اگرچہ امیر المومنین بطور قرض لینا چاہتے ہیں مگر بعد میں آنیوالے لوگ اسکو اپنی ملکیت قرار دے لینگے۔ چنانچہ آگے چلکر بعینہٖ یہی کچھ ہوا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ اس طرح غربا و مساکین مزید غریب ہوتے چلے جائیں گے اور مالدار لوگ مزید دولت مند ـــــ کعب الاحبار اس تصرف کو جائز قرار دیتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ان کے اسی فتوی پر عمل کیا۔ اگرچہ دوسرے لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے خلاف الزامات کی فہرست میں یہ بھی ایک الزام تھا۔

ابوذر غفاریؓ شام میں

ابوذر غفاریؓ شام پہنچ گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ امیر معاویہ ایک عالی شان محل تعمیر کرا رہے ہیں جس کا نام "الخضراء" تھا اور ہزاروں مزدور کام پر لگ رہے ہیں جو صبح و شام سامانِ عمارت لاتے لیجاتے ہیں۔ معاویہ ایک دن اپنا یہ محل دیکھنے آئے۔ ابوذرؓ بھی اُدھر سے گذر رہے تھے۔ وہ فوراً معاویہ کے پاس پہنچے اور فرمایا:

—— معاویہ! اگر یہ اللہ کے مال میں سے ہے تو خیانت ہے اور اگر یہ تیرا اپنا مال ہے تو اسراف ہے۔

حضرت معاویہؓ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت ابوذرؓ سیدھے مسجد میں چلے گئے اور جا کر بیٹھ گئے

جس روز سے حضرت ابوذرؓ یہاں آئے تھے ان کے پاس برابر لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ آپ انھیں وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ لوگ برابر آ کر امیر معاویہؓ کی شکایتیں کرتے تھے۔ یہ شکایتیں عموماً اموال کی غلط تقسیم کے متعلق ہوتی تھیں۔ لوگ آتے تھے اور کہتے تھے کہ سال کبھی کا ختم ہو چکا ہے مگر ان کو اب تک ان کے عطایا نہیں دیئے گئے۔ وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو رہے ہیں مگر انھیں کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس کے برعکس کبھی سنتے ہیں کہ فلاں امیر کو اتنا انعام دیا گیا، فلاں دولتمند کو اتنا کچھ بخشدیا گیا۔ ابوذر غفاریؓ یہ سب کچھ سنتے تھے آخر ایک دن ضبط نہ ہو سکا تو انھوں نے مسجد میں ایک پُرزور تقریر فرمائی۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا:

اس قسم کی باتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں جو میں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھیں۔ خدا کی قسم نہ وہ کتاب اللہ میں ہیں اور نہ ہی اس کے نبی کی سنت میں۔ خدا کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ حق کو مٹایا جا رہا ہے۔ باطل کو زندہ کیا جا رہا ہے اور سچ کو جھٹلایا جا رہا ہے اور بلا خوف خدا ترجیحی معیار قائم کئے جا رہے ہیں۔

مالدار لوگو! ضرورت مندوں کی خبر گیری کرو اور ان لوگوں کو جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ آگ کی سلاخوں سے داغ لگائے جانے کی وعید سناؤ جس سے ان کے چہروں، پہلوؤں اور کمروں کو داغ دیا جائے گا۔ اے مال کے جمع کرنیوالے یاد رکھ۔ مال میں تین آدمی شریک ہیں۔ (۱) تقدیر جو تجھ سے پوچھے بغیر اپنے فیصلے صادر کر دیتی ہے۔ (۲) وارث جو اس کا منتظر ہے کہ تو کب آنکھیں بند کرے اور وہ اس مال کو لیجائے۔ (۳) خود تو اگر تو ایسا کر سکتا ہے کہ تو ان دونوں سے بازی لیجائے تو ضرور ایسا کر۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "تم نیکی اور بھلائی کو کبھی بھی نہیں پا سکتے جب تک تم اپنی مرغوب و محبوب چیزوں کو سب کے لئے عام نہ کر دو۔

اے مال کو جمع کرنیوالو! کیا تم نہیں جانتے کہ آدمی جب مرجاتا ہے تو تین اعمال کے سوا اس کے تمام اعمال ختم ہو جاتے ہیں (۱) صدقۂ جاریہ (۲) علم جس سے لوگ نفع اٹھائیں (۳) نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔ تم لوگوں نے ریشمی پردے اور دیبا کے بستر بنا رکھے ہیں تمہیں ازدی (عربی) صوف پر لیٹنے سے بھی تکلیف ہوتی ہے حالانکہ رسول اللہ صلعم بوریئے پر سوتے تھے۔ تمہارے سامنے طرح طرح کے کھانے لائے جاتے ہیں حالانکہ رسول اللہ صلعم جَو کی روٹی بھی شکم سیر ہو کر نہیں کھاتے تھے۔ اے مال کو جمع کرنیوالو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہر روز صبح کو دو فرشتے اترتے ہیں۔ ایک کہتا ہے۔ خدایا ایسے شخص کو مال دے جو اسے خرچ کر کے اپنے لئے ذخیرہ کرے اور دوسرا کہتا ہے۔ خدایا ایسے شخص کو دے جو مال کو جمع کر کے رکھے اور اس طرح ضائع کر دے۔

لوگ ابوذرؓ کی تقریر بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ غریب طبقہ کے لوگ ان پر پروانوں کی طرح گرتے تھے مگر مالدار لوگ ایک قسم کا خوف محسوس کر رہے تھے۔

جندب بن مسلمہ فہری نے حضرت ابوذرؓ کے گرد لوگوں کا میلان دیکھا تو بڑبڑائے "یہ تو بہت بڑا فتنہ ہے" اور معاویہؓ کے پاس جاکر انھیں اطلاع دی اور کہا:

— ابوذر غفاریؓ تمہارے خلاف شام میں فساد برپا کردیگا۔ اگر اہل شام کی خیر چاہتے ہو تو اس کا تدارک کرو — معاویہؓ سر جھکائے سوچتے رہے۔ کیا ابوذر پر سختی کروں؟ — نہیں — اس سے تو آگ اور بھی بھڑک اٹھے گی — کیا عثمانؓ سے شکایت کروں؟! عثمانؓ کیا کہیں گے کہ میں اپنی رعایا کے ایک آدمی کو سیدھا کرنے سے بھی عاجز آگیا؟ — یہی بہتر ہے کہ انھیں شام سے کہیں اور بھیجدوں۔ انھیں کسی غزوہ میں بھیجدوں — اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ انھیں کوئی چیز مرغوب نہیں ہوگی۔ چنانچہ امیر معاویہؓ اپنی اس تجویز پر مطمئن ہوگئے اور حضرت ابوذرؓ کو بلا بھیجا۔ ابوذرؓ تشریف لائے تو معاویہؓ کے پاس ابو درداءؓ، شداد بن اوس، عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے وہ انہی لوگوں کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ امیر معاویہؓ نے کہا:

— میں نے حضرت عمرؓ کو لکھا تھا کہ قبرص کو فتح کر لیا جائے۔ اور میں نے لکھا تھا کہ قبرص اسقدر قریب ہے کہ حمص کے دیہاتی قبرص کے کتوں کے بھونکنے اور مرغوں کی آوازوں کو سنتے ہیں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ انھیں یہ جتلادوں کہ یہ بہت ہی آسان کام ہوگا لیکن حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاصؓ کو لکھا کہ مجھے دریا اور دریائی سفر کرنے والوں کے بارے میں لکھو۔ عمرو بن العاصؓ نے لکھدیا کہ — سمندر ایک بڑی زبردست مخلوق ہے جس پر ایک چھوٹی سی مخلوق سوار ہوتی ہے جہاں آسمان اور پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر وہ ساکن ہو تو دلوں میں قلق اور ہیجان پیدا کرتا ہے اور اگر پر جوش ہو تو ہوش اڑا دیتا ہے اس میں یقین کا سرمایہ کم اور وہم اور شک کا سرمایہ زیادہ ہو جاتا ہے — سمندر پر سوار ہونے والا لکڑی کے اوپر ایک کیڑا ہے۔ اگر لکڑی جھک گئی تو ڈوب گیا اگر سیدھی رہی تو نجات پا گیا۔

— اس کے بعد حضرت عمرؓ نے مجھے جواب میں لکھا — اس خدا کی قسم جس نے محمد صلعم کو حق کے ساتھ بھیجا۔ میں کبھی کسی مسلمان کو سمندر میں سوار نہیں کروں گا — اب میں نے دوبارہ فتح قبرص کے متعلق حضرت عثمانؓ پر اصرار کیا تو انھوں نے اجازت دیدی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ جو مسلمان اس میں شریک ہونا چاہے وہ اپنی خوشی اور رضامندی سے شریک ہو کسی کو مجبور نہ کیا جائے — اب معاملہ آپ حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟ — ابوذر غفاریؓ نے فرمایا:

— خدا کی راہ میں ایک دن جہاد کرنا اُن ہزار دنوں سے بہتر ہے جو گھروں میں گذار دیئے جائیں۔ ہمیں جہاد کی دعوت دی گئی ہے۔ ہمارے لئے اس دعوت کو لبیک کہنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں۔ دوسرے صحابہؓ نے بھی جو وہاں موجود تھے اس کی تائید کی۔ امیر معاویہؓ نے عبداللہ ابن قیس (حلیف بنی فزارہ) کو ان پر امیر مقرر کر دیا۔ جہاز تیار کئے گئے۔ ابوذر غفاریؓ اپنے جہاز پر سوار ہوگئے۔ کمانڈر نے لنگر اٹھانے کا حکم دیا اور یہ اسلامی بیڑہ جہاد کے لئے روانہ ہوگیا۔

فتح قبرص کے بعد پھر شام میں

جتنا عرصہ فتح قبرص میں لگا امیر معاویہؓ کو اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ لیکن جونہی قبرص فتح ہوگیا حضرت ابوذر غفاریؓ پھر شام کے پایۂ تخت میں آگئے۔ یہاں پہنچتے ہی لوگوں نے آپ سے شکایت کی کہ معاویہؓ نے اس عرصہ میں ایک نئی بدعت شروع کی ہے وہ اپنے ہر خطبہ میں یہ اعلان فرماتے ہیں کہ بیت المال کا مال اللہ کا مال ہے۔ ابوذر غفاریؓ نے فوراً بھانپ لیا کہ ان اعلانات کا مقصد کیا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ غالباً معاویہؓ یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کے

دلوں سے یہ بات محو ہو جائے کہ بیت المال کا مال عامۂ مسلمین کا مال ہے۔ اور اس مال میں بے جا تصرف کی وجہ سے آئے دن اُن پر جو اعتراضات ہوتے رہتے ہیں آئندہ کے لئے ان کا سدِّباب ہو جائے۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات جما دی جائے کہ یہ مال خدا کا مال ہے۔ اور خلیفہ اور امراء کو اپنی صوابدید کے مطابق ان اموال میں ہر تصرف کا حق حاصل ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے یہ بھی خیال کیا کہ ممکن ہے حضرت امیر معاویہؓ کی نیت خود خراب نہ ہو مگر آگے چل کر یہ تصور ایک زبردست فتنہ کا باب بن جائے گا۔ چنانچہ وہ سیدھے امیر معاویہؓ کے پاس پہنچتے ہیں۔ حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں، اجازت ملتی ہے۔ اور امیر معاویہؓ ابوذر غفاریؓ کا آگے بڑھکر بذاتِ خود استقبال کرتے ہیں۔ ابوذرؓ ان امور کی طرف توجہ نہ کرتے ہوئے فوراً سوال کرتے ہیں۔

—— اے معاویہ! آخر تم کس بنیاد پر مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کہتے ہو؟

—— ابوذر! خدا تم پر رحم فرمائے، کیا ہم سب اللہ ہی کے بندے نہیں ہیں اور یہ سارا مال اسی کا مال نہیں ہے؟

—— نہیں نہیں۔ تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔

—— بہت اچھا۔ آئندہ سے میں مسلمانوں کا مال ہی کہا کروں گا۔

ابوذرؓ واپسی کا ارادہ کرتے ہیں تو امیر معاویہؓ بات آگے بڑھاتے ہیں۔

—— ابوذرؓ! تم ہم پر ناراض کیوں ہو؟

—— اموال فئ مسلمانوں کا حق ہیں۔ تمہیں ایک حبہ بھی اس میں سے جمع کر کے رکھنے کا حق نہیں ہے۔ مگر تم رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے طریقے کی مخالفت کر رہے ہو۔ اس مال کو اپنے لئے اور بنو امیہ کے لئے جمع کر کے رکھتے ہو۔

—— ابوذر! میں مال کو اس غرض کے لئے جمع کر کے نہیں رکھ رہا جو آپ کے خیال میں ہے۔ میں تو اسے اس لئے جمع رکھتا ہوں کہ یہ محفوظ رہے اور تاکہ اسے مسلمانوں کے مصالح عامہ پر خرچ کیا جا سکے۔ میں نے مسلمانوں پر آج تک اس مال سے کبھی بخل نہیں کیا۔ کوئی ایسا مصرف نہیں ہے جس میں مال خرچ کر دینا پسندیدہ ہو اور میں نے وہاں خرچ نہ کیا ہو۔

—— تم اپنے ان عطایا سے خدا کی رضا کے طالب نہیں ہوتے بلکہ یہ چاہتے ہو کہ لوگ تمہاری تعریف کریں کہ معاویہ بڑا ہی سخی ہے چنانچہ لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔ معاویہ! تم نے مالداروں کو اور زیادہ مالدار بنا دیا ہے اور غریبوں کو اور زیادہ غریب۔

—— ابوذر! آپ اپنی اس دعوت کو چھوڑ دیجئے۔ آپ لوگوں کو ایک ایسے فتنے کی طرف دعوت دے رہے ہیں جس کی انتہا کو علام الغیوب کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

—— خدا کی قسم میں اس دعوت سے اس وقت تک باز نہیں آؤں گا جب تک دولتمند لوگ اپنے مالوں کو غربا کیلئے عام نہ کر دیں۔

ابوذر غفاریؓ کو خریدنے کی کوشش

ابوذرؓ کے چلے جانے کے بعد امیر معاویہؓ دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے۔ پھر کمرہ میں ٹہلنا شروع کر دیا اور اس کے بعد ایک تدبیر سوچی۔ انھوں نے تین سو دینار کی ایک تھیلی منگائی اور ایک خادم کو یہ تھیلی دیکر ابوذرؓ کے پیچھے پیچھے دوڑایا کہ یہ تھیلی ابوذر غفاریؓ کو دے آؤ۔ ابوذر غفاریؓ مکان تک پہنچنے نہیں

پائے تھے کہ خادم نے راستہ ہی میں ان کو جالیا اور عرض کیا:

—— امیر نے یہ تھیلی آپ کے پاس بھیجی ہے۔

ابوذرؓ نے تھیلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

—— اگر یہ میرا وہ مقررہ وظیفہ ہے جو مجھے اس سال نہیں ملا تو میں اسے قبول کر سکتا ہوں۔ اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

خادم اس کا کوئی جواب نہ دے سکا تو ابوذرؓ نے کہا

—— اسے واپس لیجاؤ۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔

جامع دمشق میں ابوذر غفاری کی دوسری تقریر

ابوذر غفاری سیدھے مسجد میں پہنچے اور ایک طویل خطبہ دیا۔ حسب معمول پھر ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔ ابوذرؓ نے فرمایا —— مالدار لوگو! خدا نے جو کچھ تمہیں دیا ہے غریبوں کے لئے عام کر دو اور دنیوی زندگی پر دھوکہ نہ کھاؤ۔ اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا حق رکھو۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا تمہیں بہت سا مال جمع کرنے نے غافل بنا رکھا ہے۔ ابن آدم کہتا ہے۔ میرا مال میرا مال۔ حالانکہ تیرا مال وہی ہے جو تو نے کھا لیا اور فنا کر دیا۔ یا پہن لیا اور بوسیدہ کر دیا، یا مفادِ عامہ کے لئے دیدیا اور اس طرح محفوظ کر لیا۔ اے مالدار لوگو! خدا نے مال جمع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے۔ بربادی ہے سونے چاندی کے لئے۔ بربادی ہے سونے چاندی کے لئے۔ یہ بات جیسا کہ آج تم پر گراں گزرتی ہے ایسے ہی اصحاب رسول پر بھی گراں گذری تھی۔ وہ آپس میں کہنے لگے۔ پھر ہم کونسا مال جمع کریں۔ آخر حضرت عمرؓ نے ان سے کہا۔ یہ بات میں رسول اللہ سے معلوم کر کے آتا ہوں۔ وہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

—— آپ کے اصحاب پر آپ کے ارشاد کا بڑا اثر ہے۔ وہ پوچھ رہے ہیں کہ اگر سونا چاندی جمع نہ کریں تو کونسا مال جمع کریں۔

اس پر محبوب نبیؐ نے فرمایا:

—— ایسی زبان جس پر ہر وقت قرآن رہے، ایسا دل جو مطمئن ہو اور ایک ایسی رفیقۂ حیات جو دین میں تمہاری معین و مددگار ہو۔

یقیناً اموال نے مسلمانوں کا حق ہیں لیکن معاویہؓ نے انہیں روک رکھا ہے تاکہ اپنے خادموں، چوکیداروں اور اپنی شان و شوکت پر انہیں خرچ کرے۔ معاویہ بھول گیا ہے کہ اللہ کے مال میں سے اس کے لئے دو جوڑوں کے سوا —— ایک جوڑا گرمی کا ایک سردی کا اور حج و عمرہ کا سفر خرچ، اور قریش کے ایک درمیانی آدمی کی طرح (جو نہ مالدار ہو نہ فقیر ہو) اپنے اور اپنے گھر والوں کے نان نفقے کے سوا اس کے لئے اور کچھ جائز نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہی سنت قائم کی تھی۔ معاویہ ان کی پیروی کیوں نہیں کرتا۔ مال فئے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں پر تقسیم کر دیا جائے جیسا کہ نبی صلعم اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں ہوتا تھا۔ اب جائدادیں اور مکانات بنائے جا رہے ہیں۔ ان کی تزئین و آرائش پر ہزارہا دینار خرچ کئے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑا جا رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حج کیا اور اپنے آنے جانے میں سولہ دینار خرچ کئے، تو اپنے بیٹے سے فرمایا۔ ہم نے اپنے اس سفر خرچ میں اسراف سے کام لیا ہے ——

عمر امیر المومنین اپنے حج میں سولہ دینار خرچ کرتے ہیں تو اس کو زیادہ سمجھتے ہیں، اور معاویہ بنو امیہ پر ہزاروں دینار تقسیم کر کے بھی انہیں کم سمجھتا ہے۔

اس پر ایک قریب کے آدمی نے آہستہ سے کہا۔

—— آپ معاویہؓ پر نکتہ چینی کر رہے ہیں ذرا ڈرتے رہیے۔

ابوذرؓ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا

—— مجھے میرے خلیلؐ نے وصیت فرمائی ہے کہ حق بات کہوں خواہ وہ کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کروں۔ اور میں وہی دعا کرتا ہوں جو آپ کیا کرتے تھے۔ خدایا میں بزدلی، بخل اور بڑھاپے اور دنیا اور عذاب قبر کے فتنہ سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔ اور پھر اپنی تقریر شروع کر دی۔

—— لوگ انواع و اقسام کے کھانے تیار کرتے ہیں اور قسم قسم کے کھانے کھاتے ہیں حتیٰ کہ ان کو ہضم کرنے کیلئے دوائیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ رسولؐ اللہ دنیا سے تشریف لیگئے اور ایک دن میں دو طرح کے کھانوں سے کبھی اپنا پیٹ نہیں بھرا۔ کھجور کھالی ہے تو روٹی نہیں کھائی۔ آلِ محمدؐ نے کبھی صبح و شام پیاپے تین دن تک جَو کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی حتیٰ کہ دنیا سے تشریف لیگئے۔ رسول اللہ صلعم کے گھرانے پر دو دو مہینے گذر جاتے تھے اور آپ کے گھروں میں آگ نہیں جلتی تھی، نہ روٹی کے لئے نہ کچھ پکانے کے لئے۔

کسی نے پوچھا کہ پھر کیا چیز کھا کر زندہ رہتے تھے؟

آپ نے فرمایا —— کھجور اور پانی پر۔ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے۔ پیٹ سے بدتر اور کوئی برتن نہیں ہے جسے آدمی بھرتا ہو۔ ابنِ آدم کے لئے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا رکھ سکیں۔ اگر بھرنا ہی ہو تو ایک تہائی پیٹ بھرنا چاہیئے۔ اور ایک تہائی پانی کے لئے اور تیسرا ایک تہائی سانس کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے پیٹ بھر کر نہ کھاؤ کیونکہ اس طرح صلوٰۃ میں سستی اور کاہلی پیدا ہوتی ہے۔ جسم خراب ہو جاتا ہے اور بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ غذا میں درمیانہ روی اختیار کرو۔ فضول خرچی سے بچو گے بدن تندرست رہے گا اور سعی و عمل کی قوت قائم رہے گی۔

یہ نہ سمجھو کہ رسولؐ کے صحابہ دنیا میں اسلئے زہد اختیار کرتے تھے کہ ان کے پاس خرچ کرنے کیلئے مال نہیں ہوتا تھا۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ خدا کی رضا اور ان وعدوں کو پورا کرنے کیلئے ایسا کرتے تھے جو انہوں نے اپنے خدا سے کر رکھے تھے اور اس طرح ان برکات کو حاصل کرنے کے لئے جن کا خدا نے ان سے وعدہ کر رکھا تھا —— خدا نے جب رزق میں وسعت کر دی تو حضرت حفصہؓ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا۔

—— امیر المومنین اب تو خدا نے رزق میں وسعت کر دی ہے اور مدینہ میں اموال کی بہتات ہے کاش آپ اس سے ذرا نرم لباس پہنیں اور اس سے بہتر کھانا کھائیں —— حضرت عمرؓ نے فرمایا —— میں تم ہی پر فیصلہ چھوڑتا ہوں۔ تمہیں یاد نہیں کہ رسول اللہ صلعم اور ابوبکرؓ کس قسم کی زندگی گذارتے تھے۔ حضرت عمرؓ وہ تمام باتیں یاد دلاتے رہے حتیٰ کہ حضرت حفصہؓ رو پڑیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا —— میں ان دونوں کی طرح پُر مشقت زندگی گذارنا چاہتا ہوں تاکہ آخرت کی پسندیدہ زندگی میں ان کے ساتھ شریک رہ سکوں۔"

رسول اللہ صلعم مال غنیمت کا خمس وصول فرمایا کرتے تھے مگر اس سے نہ کچھ جمع فرماتے تھے نہ ذخیرہ کرتے تھے بلکہ جو کچھ آپ کے پاس آتا اس کو تقسیم فرما دیا کرتے تھے اور اس کے بعد بسا اوقات اپنے کھانے کیلئے بھی نہیں بچتا تھا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی یہی دعوت رہی، وہ برابر مالداروں پر سخت تنقید کرتے اور مال جمع کرنے سے روکتے رہے۔ ضرورتمندوں کی خبرگیری ان کا پیغام اور مال کا کھلا رکھنا ان کا مطالبہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ لوگ اسی حال پر زندگی بسر کریں جس طرح رسول اللہ صلعم اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں بسر کرتے تھے۔ دولت مند لوگ لازماً ان کی اس دعوت سے جز بز ہوتے تھے۔ بالآخر انھوں نے معاویہؓ سے التجا کی اور ابوذر غفاریؓ کی دعوت کی وجہ سے عام لوگوں کی طرف سے جو ان کو خطرات درپیش تھے ان کی شکایت کی۔ امیر معاویہؓ نے ابوذر غفاریؓ کو طلب کیا اور اس عزم کے ساتھ طلب کیا کہ اس فتنہ کی ہمیشہ کیلئے بیخ کنی کر دیں۔

ابوذر غفاریؓ، معاویہؓ کے سامنے حاضر ہوئے۔ دبلا پتلا لمبا قد گندم گوں چہرہ، جس پر عزم و ارادہ کی پختگی کے آثار ہویدا تھے۔ معاویہؓ ان کے استقبال کیلئے کھڑے ہوئے اور اپنے قریب ان کو جگہ دی۔ اس کے بعد خدام کو آواز دی اور کھانا حاضر کرنے کا حکم دیا۔ خوان لگا دیا گیا جس میں انواع و اقسام کے لذیذ کھانے تھے۔ امیر معاویہؓ نے ابوذر غفاریؓ سے بھی شرکت کی درخواست کی مگر انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا:

—— رسول اللہؐ کے زمانے سے میرا کھانا ہفتہ بھر کیلئے ایک صاع جَو رہا ہے۔ خدا کی قسم میں اس پر زیادتی نہیں کروں گا حتی کہ رسول اللہؐ کے پاس پہنچ جاؤں —— پھر معاویہؓ سے فرمایا —— تم لوگوں نے اپنی عادتیں بدل دی ہیں۔ تمہارے لئے آٹا چھان کر پکایا جاتا ہے حالانکہ رسول اللہؐ کے زمانے میں چھانا نہیں جاتا تھا۔ پتلی پتلی چپاتیاں پکائی جاتی ہیں۔ قسم قسم کے سالن اور طرح طرح کے کھانے سامنے لائے جاتے ہیں۔ صبح کسی لباس میں نکلتے ہو تو شام کو کسی دوسرے لباس میں۔ تم لوگوں کا رسولؐ اللہ کے زمانے میں تو یہ حال نہیں تھا۔"

—— وہ زمانہ گذر گیا۔ ہم یہاں عجمیوں کے ملک میں ہیں۔ اگر ہم ان کے سامنے مناسب ہیئت میں نہ آئیں تو ان کی نگاہوں میں ہماری عزت نہیں رہے گی۔

—— میں تو اپنی ہیئت نہیں بدلوں گا۔ ممکن ہے اس طرح قیامت کے دن میری مجلس حضورؐ سے قریب ہو جائے کیونکہ میں نے رسولؐ اللہ سے سنا ہے آپؐ فرماتے تھے کہ قیامت کے دن مجھ سے مجلسی قُرب اسی کو حاصل ہوگا جو دنیا سے اسی حالت میں جائے جس حالت میں میں اسے چھوڑ کر جا رہا ہوں اور خدا کی قسم سوائے میرے تم میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے کچھ نہ کچھ دنیا حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔

—— ابوذر! مالدار لوگ تمہارے شاکی ہیں۔ تم ضرورت مند لوگوں کو ان کا مخالف بنا رہے ہو۔

—— میں انھیں مال جمع کرنے سے روکتا ہوں۔

—— کیوں؟

—— اس لئے کہ خدا کا حکم ہے والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیمہ

تو میں تو انھیں خدا کے عذاب ہی سے ڈراتا ہوں۔

—— یہ آیت تو اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

—— ہرگز نہیں، اُن کے اور ہمارے سب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

—— میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اسے چھوڑ دو۔

—— خدا کی قسم میں قرآن کی دعوت برابر دیتا رہوں گا اور سونا چاندی جمع کرنے سے مسلسل ڈراتا رہوں گا اور مال جمع کرنے والوں کو برابر آگ کے عذاب کی وعید سناتا رہوں گا۔

—— تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ اس شغل کو چھوڑ دو۔

—— خدا کی قسم میں اسوقت تک اسے نہیں چھوڑ سکتا جب تک تمام اموال مساوی طور پر لوگوں میں تقسیم نہ کر دیئے جائیں۔

معاویہؓ نے تہدید آمیز لہجہ میں کہا

—— آج سے میں اور تم الگ ہو۔ اب بچتے رہو۔ سمجھے ابوذر!

—— سمجھ لیا میں نے، لیکن خدا نے جو کچھ مقدر کر دیا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ پیش نہیں آسکتا۔

امیر المومنین سے شکایت

امیر معاویہؓ نے دیکھا کہ ابوذرؓ کے ساتھ نرمی کرتے ہیں تو اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، سختی کرتے ہیں تب بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ان کو خریدنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس میں بھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اب سوائے اس کے اور کوئی تدبیر باقی نہیں رہی تھی کہ ان کو شام سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے مجبور ہو کر حضرت عثمانؓ کو خط لکھا جس میں تحریر تھا

ابوذرؓ کے گرد ہر وقت کثیر مجمع رہتا ہے اور انھوں نے مجھے تنگ کر دیا ہے میں اب عاجز آگیا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ لوگوں کو آپ کا مخالف بنا دینگے اگر آپ کو ملت کا کچھ خیال ہے تو ان کو بلا لیجئے۔

امیر المومنین نے اس خط کا جواب دیا۔

فتنہ نے اپنی آنکھیں اور ناک باہر نکال دی ہیں۔ اتنی ہی کسر رہ گئی ہے کہ وہ حملہ کر بیٹھے۔ لہٰذا تم زخم کو چھیڑو نہیں اور ابوذرؓ کو میرے پاس بھیج دو اور جہاں تک ممکن ہو خود کو اور لوگوں کو فتنہ میں پڑنے سے روکو۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسی حد تک تم روک سکتے ہو۔

ابوذر غفاریؓ پھر مدینہ منورہ میں

چنانچہ ابوذر غفاریؓ کو پھر مدینہ منورہ واپس بھیج دیا گیا۔ جس وقت امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے سامنے ان کو پیش کیا گیا اتفاق سے وہاں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ بھی موجود تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا

—— خدا تمہاری آنکھیں ٹھنڈی نہ رکھے اے جُنیدب!

—— میں جنیدب ضرور ہوں مگر میرا نام رسول اللہ صلعم نے عبداللہ رکھ دیا تھا تو میں نے ہمیشہ اپنے پہلے نام پر رسول اللہ کے رکھے ہوئے

نام ہی کو ترجیح دی ہے۔

—— کیا بات ہے، شام والے تمہاری بدزبانی کی بہت زیادہ شکایت کرتے ہیں؟

—— لوگوں نے مال جمع کر رکھے ہیں اور میں ان کو اس پر آگ کی سلاخوں سے داغے جانے کی وعید سناتا ہوں۔

—— تم وہی تو ہو جو میرے متعلق بھی یہ نقل کرتے ہو کہ میں یوں کہتا ہوں کہ خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں؟

—— اگر تم ایسا نہ سمجھتے ہوتے تو خدا کے مال کو خدا کے بندوں کیلئے عام کر دیتے۔ میں نے تمہیں نصیحت کی اور تم مجھ سے بدگمان ہو گئے۔ میں نے تمہارے صاحب (معاویہ) کو نصیحت کی تو وہ بھی مجھ سے بدگمان ہو گئے۔

—— تم جھوٹ بولتے ہو، بلکہ تم فتنہ کو پسند کرتے ہو اور فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہو جس کی وجہ سے تمام شام میں ہمارے خلاف شورش ہو رہی ہے۔

—— اپنے دونوں ساتھیوں (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے طریقہ کی پیروی کرو پھر تم پر کوئی اعتراض نہیں کریگا۔

—— تمہارا اس سے مطلب! تم کون ہوتے ہو؟

—— میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سوا اپنے لئے کوئی چارہ کار نہیں پاتا۔

حضرت عثمانؓ کا چہرہ غضب آلود ہو گیا اور انھوں نے حاضرین سے کہا

—— اس کذاب بوڑھے کے بارے میں مجھے مشورہ دو۔ اس کو مار دوں یا قتل کر دوں یا سرزمین اسلام سے خارج کر دوں۔ اس نے مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا،

آلِ فرعون کے مومن نے جو کچھ مشورہ دیا تھا وہی میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں۔ اگر یہ جھوٹا ہے تو اپنے جھوٹ کا وبال خود اٹھائے گا اور اگر یہ سچا ہے تو جن نتائج سے وہ تم کو ڈرا رہا ہے وہ تم کو پیش آ کر رہیں گے۔ یقیناً خدا ایسے آدمی کو جو اپنے اوپر زیادتی کرے اور جھوٹ بولے کبھی صحیح راہ نہیں دکھاتا۔

اس مشورے پر حضرت عثمانؓ کے لہجہ میں شدت آ گئی اور انھوں نے ابوذرؓ کو متہم کیا کہ وہ علیؓ کے مددگاروں میں سے ہیں اور ان کیلئے خلافت کی کوشش میں ایسا کر رہے ہیں جس پر حضرت علیؓ نے بھی سخت جواب دیا۔ باقی لوگ درمیان میں آ گئے اور جھگڑے کو رفع دفع کیا۔ آخر میں حضرت عثمانؓ نے حکم دیدیا —— میں لوگوں کو ابوذرؓ کے پاس اٹھنے بیٹھنے اور ان سے بات کرنے کی ممانعت کرتا ہوں۔

مگر مورخین کا بیان ہے کہ لوگوں کا ابوذرؓ کے گرد اس قدر ہجوم رہتا تھا کہ شاید انھوں نے اس سے پہلے ابوذر کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ابوذرؓ اپنی دعوت میں برابر مصروف تھے۔ دولتمندوں پر نکتہ چینی، غریبوں اور مسکینوں کی خبر گیری اور مواسات کا درس۔ مسلمانوں پر مساویانہ اموال کی تقسیم کا مطالبہ یہی ان کی دعوت کے تین اجزا ہوتے تھے۔

حضرت عثمانؓ نے دیکھا کہ ان کی مخالفت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو آخر انھوں نے ابوذرؓ کو دربار میں طلب کیا اور فرمایا

—— ابوذرؓ! تم اپنے اس مشغلہ کو نہیں چھوڑو گے؟

—— اس وقت تک نہیں جب تک دولت مند لوگ غربا کی خبر گیری نہ کریں۔

جو لوگ وہاں بیٹھے تھے حضرت عثمانؓ نے ان سے سوال کیا:

—— کیا خیال ہے، جو لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دیتے ہیں کیا پھر بھی ان کے مال میں دوسروں کا حق رہ جاتا ہے؟

کعب الاحبار نے کہا۔

—— نہیں۔ اے امیر المومنین!

حضرت ابوذرؓ نے کعب کے سینہ میں ایک مکا مار کر کہا

—— جھوٹ بکتا ہے۔ یہودی عورت کے بیٹے! تو جھوٹ کہہ رہا ہے اور پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی:

اس میں نیکی نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی اس شخص کی ہے جو خدا پر، یوم آخر پر، ملائکہ پر، کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لاتا ہے، اور مال کی محبت کے باوجود اسے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، ضرورت مندوں کیلئے عام کر دیتا ہے اور غلاموں کی آزادی کیلئے اسے خرچ کرتا ہے اس کے ساتھ ہی نظام صلوٰۃ کو قائم کرتا ہے اور زکوٰۃ دیتا ہے اور جو عہد کر لیتا ہے اسے پورا کرتا ہے تنگی ترشی میں اور جنگ کے موقعہ پر ہمت سے کام لیتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جو سچے مومن ہیں اور یہی لوگ تقویٰ شعار ہیں۔

اس پر حضرت عثمانؓ نے فرمایا

—— ابوذر! میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں لوگوں کو زاہد بنا دوں بلکہ میرا اتنا ہی فریضہ ہے کہ میں ان کے درمیان اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کروں اور انھیں میانہ روی کی ترغیب دوں۔

—— ہم ان دولتمندوں سے اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک یہ لوگ مال کو مال عام نہ کر دیں اور پڑوسیوں اور اپنے بھائیوں کے ساتھ عمدہ سلوک اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ نہ کریں۔

اس پر پھر کعب احبار نے درمیان میں دخل دیا اور کہا:

—— جس نے فریضۂ الٰہی (زکوٰۃ) ادا کر دیا اس نے وہ سب کچھ ادا کر دیا جو اس کے ذمہ تھا۔

ابوذر غفاریؓ نے اپنی لکڑی اٹھائی اور کعب کے سینہ پر مار دی۔

اتنے میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا ترکہ پیش ہوا جو وہ چھوڑ کر مرے تھے۔ تھیلیوں کا ایک انبار تھا جو حضرت عثمانؓ اور سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے فرمایا

—— میں عبدالرحمٰن کیلئے اچھی توقعات رکھتا ہوں وہ زندگی بھر خیرات و مہمان نوازی کرتے رہے اور بعد کیلئے بھی اتنا کچھ چھوڑ گئے جو تمہارے سامنے ہے۔

—— کعب الاحبار نے عرض کیا —— امیر المومنین! آپ بجا فرما رہے ہیں۔ انھوں نے حلال کمایا، حلال خرچ کیا اور حلال چھوڑا۔ خدا نے انھیں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی دی۔

اس مرتبہ ابوذرؓ نے کعب کے سر پر اپنا عصا مارا اور انھیں لہولہان کر دیا۔ اور فرمایا:

—— یہودی کے بیٹے! تو اس شخص کے متعلق جو اتنا کثیر مال چھوڑ کر مرا ہے کہتا ہے کہ خدا نے اسے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی سے نوازا ہے۔ تو خدا کے متعلق کس قطعیت سے یہ بات کہتا ہے۔ حالانکہ ایک روز رسول اللہ صلعم جبل احد کی طرف تشریف لیگئے اور میں آپ کے ساتھ تھا تو آپ نے فرمایا "اے ابوذر!" میں نے عرض کیا۔ لبیک یا رسول اللہ۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ قیامت کے دن یہ بڑے بڑے مالدار ہی فقیر ہوں گے بجز اُن لوگوں کے جو اپنے دائیں بائیں آگے اور پیچھے اس مال کو دونوں ہاتھوں سے یوں یوں خرچ کریں۔ مگر ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔" پھر فرمایا "اے ابوذر!" میں نے کہا "ہاں اے رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں" آپ نے فرمایا "مجھے یہ بات قطعاً پسند نہیں کہ میرے پاس اگر کبھی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو تو میں اس میں سے اپنے لئے دو قیراط بھی بچا کر رکھ لوں" میں نے عرض کیا "اے رسول اللہ دو ڈھیر فرمائیے" آپ نے فرمایا "نہیں بلکہ دو قیراط" پھر فرمایا "اے ابوذر! تم بہت چاہتے ہو اور میں کم چاہتا ہوں"۔

—— تو رسول اللہ تو یہ چاہتے تھے اور یہودی عورت کے بیٹے! تو کہتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف اتنا کچھ چھوڑ گیا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔

حضرت عثمانؓ نے کعب سے درخواست کی کہ ابوذر نے ان کو زخمی کر دیا ہے وہ انہیں معاف کر دیں۔ چنانچہ کعب نے معاف کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے ابوذرؓ سے کہا —— میرے لئے تمہاری ایذا بہت بڑھ گئی ہے۔ تم کہیں اپنا چہرہ مجھ سے چھپا لو۔

—— میں مکہ چلا جاؤں۔

—— نہیں مکہ میں ہرگز نہیں۔

—— تو آپ مجھے خدا کے گھر سے بھی روکتے ہیں جہاں میں اس کی عبادت کرتا رہوں حتیٰ کہ مر جاؤں۔

—— ہاں بالکل روکتا ہوں۔

—— تو شام چلا جاؤں۔

—— نہیں ہرگز نہیں

—— تو بصرہ

—— نہیں نہیں۔ ان کے علاوہ کوئی جگہ پسند کرو۔

—— ان شہروں کے علاوہ میں کسی شہر کو پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ مجھے میرے دارالہجرت (مدینہ منورہ) میں رہنے دیں تو میں کسی دوسرے شہر کی خواہش نہیں کروں گا۔ اب آپ ہی جہاں چاہیں مجھے بھیجدیں۔

—— تو میں تمہیں ربذہ کی طرف بھیج دیتا ہوں۔

چنانچہ وہ ربذہ کے صحراء میں جلاوطن کر دیئے گئے اور اسی جلاوطنی کی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ممکن ہے یہ کہدیا جائے کہ یہ واقعات بھی تو اسی تاریخ سے لئے گئے ہیں جسے تم ظنی کہتے ہو۔ یہ ٹھیک ہے لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ہم انہیں محض اس لئے قرین قیاس سمجھتے ہیں کہ یہ اصولی طور پر اس قرآن کی تعلیم کے قریب تر ہیں جسے ہم تک خدا نے اپنی حفاظت کے سایہ میں پہنچایا ہے۔ اور یہی ہمارے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار ہے۔